انتہا پسندی اور جمہوریت
کے سفر کے مابین پیچیدہ تنازعات اور

پاکستانی ذرائع ابلاغ

حقائق پر مبنی رپورتاژ

انٹرنیشنل میڈیا سپورٹ
جولائی 2009ء

فہرست

نقشہ 5

جامع تلخیص 6

1 تعارف 8

2 پاکستانی پس منظر 10

2.1 پاکستان کا سیاسی و معاشرتی پس منظر 10

2.2 فوجی دور اور جمہوریت 11

2.3 علاقائی محرکات، پاکستان، افغانستان اور دہشت گردی کی جنگ 11

2.4 پاکستانی کی معاشرتی اور گروہی ساخت 12

2.5 مذہب 13

3 ذرائع ابلاغ کے کوائف 14

3.1 نمایاں خدوخال 14

3.2 پاکستانی میڈیا کا تاریخی پس منظر 15

3.3 قانونی ڈھانچہ 16

3.4 پاکستان میں ذرائع ابلاغ 20

3.5 تعلیمی اور تربیتی ادارے 23

3.6 پاکستان میں صحافت اور صحافتی کارکن 23

4 موجودہ تنازعات کی روشنی میں میڈیا کی مشکلات 25

4.1 پاکستانی میڈیا کے لیے حفاظتی دشواریاں 25

4.2 میڈیا میں بگاڑ 30

4.3 معلومات کا خلاء 32

4.4 صحافتی استعداد کار 34

4.5 پاکستان اور افغانستان: سرحدی تعلقات اور خبریں 37

5 سفارشات 39

5.1 صحافیوں کی حفاظت اور تحفظ 39

5.2 پاک افغان صحافتی تعلقات 42

5.3 شورش زدہ علاقوں میں معلومات کا فقدان اور میڈیا کا ابتر نظام 45

5.4 صحافتی قابلیت 47

6 لف شدہ مواد 50

6.1 انٹرویوز 50

6.2 حوالہ جات 52

مخفّفات

APNS	آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
NWFP	شمال مغربی سرحدی صوبہ
PEMRA	پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی
PFUJ	پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس
PML-N	پاکستان مسلم لیگ۔نواز
PPP	پاکستان پیپلز پارٹی
PPO	پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی نینس
PTV	پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن
FATA	وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات

نقشہ

FATA &
NWFP
PAKISTAN
INDIA
NWFP
Mingora
AFGHANISTAN
Peshawar
Islamabad
FATA
PAKISTAN
Balochistan
0
50
100km
FEDERALLY ADMINISTERED
TRIBAL AREAS (FATA)
NORTH WEST FRONTIER
PROVINCE (NWFP)

جامع تلخیص

پاکستان 9 سال تک فوجی حکومت کے زیر اثر رہنے کے بعد گذشتہ دو سالوں سے جمہوریت کے تلخ دور سے گذر رہا ہے۔ گذشتہ ناکام دورانیہ کے برعکس جمہوریت کے موجودہ دور میں میڈیا کا آزاد خیال کردار ابھر کر سامنے آیا ہے جس سے دوٹوک اور مثبت رویوں کا تاثر ملتا ہے اور ایسا تب ہی ممکن ہے۔ اگر ذرائع ابلاغ جمہوریت کی نشوونما کے لیے بھرپور سرپرستی کا مظاہرہ کریں۔ پاکستانی میڈیا کا کردار خاصی لچکدار اہمیت کا حامل رہا۔ حالانکہ یہاں مشکلات بدرجہ اتم موجود ہیں اور ان کی راہ میں کئی رکاوٹیں حائل رہیں۔

اس رپورٹ میں ان عوامل پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جن سے پاکستانی میڈیا، موجودہ متنازعہ اور پیچیدہ صورت حال میں نبرد آزما ہے۔ مزید برآں ایسی سفارشات بھی مرتب کی گئی ہیں جو کہ پاکستانی ذرائع ابلاغ کے لیے مستقبل میں درپیش چیلنجوں سے نمٹنے میں ممد و معاون ثابت ہوں گی۔

میڈیا کے مناظر

سیاسی دباؤ اور بسا اوقات حکومتی پابندیوں کے باوجود پاکستانی میڈیا خوب پھل پھول رہا ہے اور اسے بڑی حد تک آزادی بھی حاصل ہو چکی ہے۔ 2002 میں ذرائع ابلاغ کی آزاد خیالی سے ٹیلی ویژن کی دنیا میں انقلاب بپا ہوا، مقابلے کے ماحول اور تجارتی مفادات کی جنگ نے سنسنی خیزی کو بڑھاوا دیا۔ ریڈیو کے میدان میں اتنی ترقی نہیں دیکھی گئی، مگر اس کے باوجود معلومات فراہم کرنے کے حوالے سے متعدد آزاد ریڈیو چینلز وجود میں آئے اور دیہی علاقوں میں ان کے کلیدی کردار سے انکار بھی ممکن نہیں۔

پاکستانی میڈیا متعدد زبانوں اور مختلف قومیتوں اور نسلوں پر مبنی معاشرے کا گلدستہ ہے۔ انگریزی اور اردو صحافت کے درمیان واضح حد فاصل قائم ہے۔ اردو میڈیا کے شعبے میں شائع ہونے والے اخبارات دیہی علاقوں میں خاصے مقبول ہیں اور بہت بڑی تعداد میں پڑھے جاتے ہیں۔ جہاں تک انگریزی میڈیا کا تعلق ہے یہ اردو میڈیا کی نسبت زیادہ آزاد خیال اور پیشہ وارانہ اہمیت کا حامل ہے اور اس سے شہروں میں بسنے والے مخصوص طبقے کے افراد ہی استفادہ کرتے ہیں۔ انگریزی کے اخبارات، رسائل، ٹیلی ویژن اور ریڈیو چینلز کے سامعین و ناظرین اردو پڑھنے سننے والے قارئین کی نسبت نہایت قلیل تعداد پر مشتمل ہیں لیکن اہلِ نظر افراد، سیاستدان، تاجر اور معاشرے کے بالائی طبقے کے لوگ انگریزی میڈیا کے ہی دلدادہ ہیں۔

میڈیا اور تنازعات

دنیائے صحافت میں پاکستان کا شمار خطرناک ترین ممالک میں ہوتا ہے۔ وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں (فاٹا) اور شمال مغربی صوبہ سرحد کے شورش زدہ علاقوں میں سیکورٹی کی صورت حال نہایت دگرگوں ہے۔ آئے دن صحافیوں کو پروپیگنڈے، دھمکیوں، جبر و استبداد اور ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بننا پڑتا ہے اور بعض خطے تو صحافیوں کے لیے شجر ممنوعہ ہیں اور جو لوگ جوالا مکھی کے دہانوں پر کام کر رہے ہیں وہ مخالف پارٹیوں میں پہچانے جانے کے خوف سے چھپ چھپا کر صحافتی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔

اس کا فطری نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ فاٹا، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں معلومات کی آزادانہ ترسیل ہمیشہ پابندیوں کی زد پر رہی اور بروقت اطلاعات کا خلا پیدا ہو گیا۔ اس لیے اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ صحافیوں کو بہتر ماحول میں کام کرنے کے مواقع مہیا کیے جائیں اور خطرات سے آگاہی کے لیے موزوں تربیت اور حساس تنازعات سے نمٹنے کے لیے بہترین طور طریقے اور صحافتی انداز متعارف کروائے جائیں۔

پاکستانی میڈیا نہ صرف شدید تنازعات کا شکار رہا ہے بلکہ الفاظ کی جنگ، تخیلات اور پروپیگنڈے میں بھی الجھا رہتا ہے۔ فاٹا اور صوبہ سرحد میں ایک سو سے زائد بنیاد پرست اور نفرت انگیز نشریات کے حامل غیر قانونی ریڈیوز کے علاوہ مقبول عام میڈیا بھی انتہا پرستی کے ایجنڈے پر ہی عمل پیرا دکھائی دیتا ہے۔

میڈیا پر پاکستان کے علاقائی تنازعات کو افغانستان کے حالات کی روشنی میں دکھائے جانے والے مذاکرے یا تو انتہائی سطحی نوعیت کے ہوتے ہیں یا پھر دقیانوسی خیالات پر مبنی، اور ان سے دونوں ممالک میں انتہا پسندی کے مسائل سے نمٹنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

تجاویز

اس رپورٹ کی اہم تجاویز درج ذیل ہیں:

- صحافیوں اور میڈیا کے ارکان کے تحفظ کو بہتر بنانے کے لیے نظم وضبط کی پابندی، خطرات شناسی اور حساس تنازعات کے متعلق صحافتی تربیت، فوری میکانکی عمل، جامع استدلال اور اثر پذیری جیسے محرکات کا ہونا ضروری ہے۔
- پاک افغان تعلقات میں بہتری لانے کے لیے بحث ومباحثوں اور پیشہ وارانہ معاونت کی اشد ضرورت ہے۔
- میڈیا کے شعبے میں معلوماتی خلا اور صحافتی بگاڑ سے نمٹنے کے لیے انتہا پسندی کے حوالے سے فہم وفراست میں اضافے اور ریڈیائی نشریات کے ذریعے فاٹا، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں روایتی اور جدید ابلاغ عامہ کے فنون کی نشوونما کرنا ہوگی۔
- تحقیقاتی صحافت کو مضبوط بنانے کے لیے تربیت اور مالی معاونت درکار ہوگی کیونکہ ان دو عوامل کے فقدان کی وجہ سے صحافتی حضرات بڑے بڑے منصوبوں میں ہاتھ ڈالنے سے کتراتے ہیں۔
- ذاتی محاسبے اور جواب دہی کے میکانکی نظام کو پروان چڑھا کر پاکستانی صحافت کے معیار کو بلند کیا جاسکتا ہے۔

1 تعارف

تاریخی حوالے سے پاکستان ایک چوراہے پر واقع ہے، اور حالیہ دہشت گردی اور اس سے نمٹنے کی عالمی جنگ کے پس منظر میں مرکزی اہمیت کا حامل ملک ہے، اس کو کئی طویل اور شدید اندرونی بحرانوں کا سامنا رہا ہے۔ خصوصاً فروری 2008 کے انتخابات اور 9 سالہ فوجی دور کے بعد جمہوریت کے دوسرے سال میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ موجودہ ترقی کا مضبوط اور تاریخی بندھن جمہوری رواداری کا مرہون منت ہے۔ پاکستان ایک کمزور ریاست تصور کی جاتی ہے جو اقتصادی بحرانوں اور باغیانہ سرگرمیوں کے مسلسل اثرات جھیل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوامی حکومت مشکلات سے دوچار ہے۔

پاکستانی طالبان کے ساتھ شدید جھڑپوں کے بعد القاعدہ اور دوسرے عسکریت پسند گروہ ایک جگہ مجتمع ہو چکے ہیں جب کہ فوج اور ریاست دوسری جانب، اور گذشتہ سالوں میں ان کے درمیان یہ خلیج خاصی گہری ہو چکی ہے جس کا نتیجہ ہزاروں ناخوشگوار واقعات، لاکھوں لوگوں کی نقل مکانی اور حکومتی سلامتی کو لاحق خدشات کی صورت میں سامنے آیا ہے کئی علاقوں میں فوج طالبان کے خلاف حالتِ جنگ میں ہے جب کہ صوبہ سرحد کے مختلف مقامات اور قبائلی علاقوں میں شرعی قوانین کے نفاذ کا معاملہ مختلف مراحل میں ہے۔

حال ہی میں فوج کو ایک بڑی کامیابی کی نوید ملی جب اس نے ایک فیصلہ کن جنگ کے بعد طالبان کو سوات سے نکال باہر کیا اور گذشتہ رویے کے برعکس ملٹری اپریشن کو عوامی اور حزب مخالف کی بڑی جماعتوں کی حمایت بھی حاصل رہی۔

عوامی حمایت نے فوج کے حوصلوں کو بلند کیا جس سے کامیاب نتائج حاصل ہوئے۔ اس سے عندیہ یہ بھی ملتا ہے کہ باغیوں کی سرگرمیوں کو کچلنے کے لیے حالات سازگار ہیں، لیکن کیا سوات میں پاکستانی طالبان کی شکست ایک مضبوط اور مربوط پالیسی کی شروعات ہے اس کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا لیکن ایک بات یقینی ہے کہ اگر اس سیلاب کی راہ میں جامع حکمت عملی سے بند نہ باندھا گیا تو یہ پاکستان کو ایک ناکام ریاست کی جانب بہا کر لے جائے گا۔

اس ممکنہ منظرنامے کی بازگشت اٹلانٹک کونسل کے تھنک ٹینک کی ایک حالیہ رپورٹ میں بھی سنائی دیتی ہے جس میں پاکستان سے متعلق ایک جامع امریکی پالیسی کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ اٹلانٹک کونسل کی رائے میں پاکستان جمہوری اور مستحکم ریاست کے حوالے سے تیزی سے ناکامی کی جانب بڑھ رہا ہے اور اسے اصلاحات نافذ کرنے کے لیے ہر سال چار بلین ڈالرز کی امداد اور قرضوں کی فوری ضرورت ہوگی۔ اس رپورٹ میں خبردار کیا گیا ہے ''پاکستان کی موجودہ کیفیت یعنی مسلسل تنزلی کی جانب رواں اقتصادی اور سیاسی صورت حال کسی وقت بھی بڑی ناکامی پر منتج ہو سکتی ہے اور اس سے پوری طرح نمٹنے کے لیے وقت ہمارے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔[1]

9/11 کے واقعات نے پاکستان کو بین الاقوامی سیاست کے مرکزی اکھاڑے میں لا کھڑا کیا اور وہ امریکی راہنمائی میں دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی عالمی جنگ میں ایک ناگزیر کردار کی صورت میں سامنے آیا۔ بین الاقوامی برادری میں اس معاملے پر اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے کہ عالمی امن کے لیے ایک مضبوط اور مستحکم پاکستان کی ضرورت ہے لیکن ایک انتہائی اہم سوال یہ ہے کہ کیا یہ اب بھی ممکن ہے۔

جمہوریت کے استحکام کے لیے بالغ النظر سیاسی قیادت کی ضرورت ہوگی تاکہ حکومتی معاملات میں فوجی مداخلت کی راہیں مسدود کی جا سکیں۔ پاکستان کو اقتصادی بحران سے نکالنے کے لیے حل تلاش کرنا، گذشتہ جمہوری حکومت کی کمزوریوں سے قطع نظر بہتر حکومتی عملداری قائم کرنا ہوگی اور آخر میں بڑھتے ہوئے تشدد اور طالبان کے پھیلاؤ کو سختی سے روکنا ہوگا۔

اس مرحلے میں میڈیا کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اگر پاکستان میں جمہوریت کو کامیابی سے پٹڑی پر چلانا ہے تو پھر میڈیا کو آنکھیں کھلی رکھ کر سیاستدانوں پر کڑی نظر رکھنا ہوگی۔ ریاستی اداروں اور فوج کو جواب دہ بنانے کے علاوہ عوام کو ہر معاملے میں باخبر رکھنا پڑے گا۔ گو کہ پاکستانی میڈیا لچک دار رویے کا مظاہرہ کرتا آیا ہے، مگر پھر بھی اس کے لیے یہ کام ایک

1- رپورٹ برائے پاکستان: جامع امریکی پالیسی کی ضرورت، جان کیری اور چک ہیگل، اٹلانٹک کونسل، فروری 2009ء

چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے جیسا کہ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کے ذرائع ابلاغ کئی مشکلات سے دوچار ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا اپنی طاقت کے زعم میں مبتلا ضرور ہے، مگر نوجوان کارکنوں کو سیاسی اور متنازعہ امور پر متوازن کوریج کرنے کی ضرورت ہے متعدد صحافیوں کی تربیت بھی ضروری ہے۔ ملک میں بہت سے علاقے میڈیا کی پہنچ سے دور ہیں۔ شورش زدہ علاقوں میں رپورٹنگ کرنے والے صحافیوں کو حفاظتی مسائل کا سامنا ہے جس کی وجہ سے بروقت اطلاعات تک رسائی کا فقدان پیدا ہوتا ہے۔ 2008 میں 12 صحافیوں کی موت نے پاکستان کو صحافت کی دنیا میں خطرناک ترین ملک کی صف میں دوسرے نمبر پر لا کھڑا کیا ہے۔

ترجیحات اور مقاصد

پاکستان کو جمہوریت کے فروغ اور اپنے شہریوں کی خوشحالی اور امن و امان کی راہ میں کٹھن مراحل درپیش ہیں جنوری 2009 میں IMS کی جماعت ایک متفقہ معلوماتی مشن کے طور پر ملک کے دور دراز علاقوں میں صحافیوں کو درپیش سیکورٹی کی صورت حال اور میڈیا کے قرار واقعی کردار سے آگاہی کے لیے پاکستان آئی۔

اس مشن کے دو مقاصد تھے: (1) ضروریات کا تخمینہ لگانا (2) مستقبل کے ممکنہ اقدامات کی نشان دہی۔ تاکہ جلد سے جلد سرگرمیوں کا آغاز ممکن ہو۔ یہ رپورٹ مذکورہ مشن کا ہی حصہ ہے اور اس میں IMS کو اپنے مستقبل کے منصوبوں اور پاکستانی ذرائع ابلاغ اور اداروں کے ساتھ تعاون کی بنیادوں پر کام کرنا تھا۔

طریقہ کار

یہ مشن 31 جنوری سے 7 فروری 2009ء تک اسلام آباد میں قیام پذیر رہا جہاں زیادہ تر مقامی میڈیا کی تنظیمیں، وزارتی اور حکومتی دفاتر، بین الاقوامی میڈیا کے ذیلی ادارے، تعلیمی شعبہ جات اور سوچ مراکز (Think Tanks) کے مرکزی دفاتر واقع ہیں۔ مزید برآں فاٹا اور صوبہ سرحد میں صحافی برادری کے حفاظتی پہلو کو مدِنظر رکھنا بھی مشن کے اقدامات کا حصہ تھا۔

مشن کی سرگرمیوں کے دوران متعلقہ ارباب اختیار سے رجوع کیا گیا۔ IMS نے اپنی استعدادِ کار اور قابلیت میں اضافے کے لیے دوسری بین الاقوامی اور مقامی میڈیا کی تنظیموں سے رابطے کیے تاکہ مستقل تعاون کی غرض سے ان کے تجربات سے استفادہ کیا جا سکے۔

IMS مشن کی جماعت نے اس ابتدائی عرق ریزی کی بنیاد پر پاکستانی میڈیا کے متعلقہ لوگوں سے رابطے قائم کیے۔ ٹیلی ویژن، ریڈیو اور پرنٹ میڈیا کے نمائندوں، صحافیوں کی مقامی یونین، میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی، انفارمیشن کی وزارت، اور تعلیمی اداروں کے ارباب حجت کے انٹرویوز کیے گئے۔ اس تحقیق کا مرکزی خیال پاکستان میں سر اٹھانے والے تنازعات کی عام حقیقت کو سمجھنے پر مرکوز رہا اور میڈیا جو کہ ان شورش زدہ علاقوں میں مصروفِ عمل ہے، کی کارکردگی اور فہم و ادراک کے پیمانے کی جانچ شامل تھی۔ اس سلسلے میں پاک انسٹیٹیوٹ آف پیس سٹڈیز (PIPS) نے مشن کو ترتیب دینے اور موجودہ متنازعہ صورت حال کی روشنی میں مذکورہ میڈیا کے مسائل کو سمجھانے میں ہر ممکن مدد فراہم کی۔ اس پس منظر میں مہیا کردہ کوائف اور معلومات کو مقامی صحافیوں نے بصیرت آموز انٹرویوز میں قابلِ ستائش قرار دیا اور ان میں سے چند ایک تو وفاقی انتظامی قبائلی علاقوں (فاٹا)، بلوچستان اور شمالی مغربی سرحدی صوبے (NWFP) کے شورش زدہ علاقوں میں کام بھی کر چکے ہیں۔

پاکستان اور افغانستان کے درمیان تنازعاتی علاقائی ساخت کی وجہ سے ''مشن'' نے ان دونوں ممالک کے میڈیا کو مرکزِ نگاہ بنایا اور ان سے وابستہ تنظیموں، اخبارات کے ایڈیٹروں اور صحافیوں سے زمینی حقائق کی روشنی میں انٹرویوز لے کر ریسرچ مکمل کی۔

اس مشن کی مختصر جماعت، IMS پروگرام کے معاون فن راسموسن، اور دو ماہر مشیروں جناب رانگا کالنسوریا، جن کا شمار میڈیا کے ماہرین میں ہوتا ہے اور جناب جے پی ماٹزن جنہوں نے تاریخ میں ماسٹر کر رکھا ہے اور پاکستانی معاملات کے ماہر تصور ہوتے ہیں، پر مشتمل تھی۔

2 پاکستان کا پس منظر

2.1 پاکستان کا سیاسی و معاشرتی پس منظر

پاکستان کے وجود میں آنے کی کہانی دراصل ایک تخیل کی تکمیل ہے۔ اس نظریے کے پیچھے یہ عوامل کارفرما تھے کہ برصغیر میں مسلم اقلیت کے لیے علیحدہ ریاست کا وجود ضروری ہے ورنہ انڈیا کی ہندو اکثریت کی اجارہ داری قائم رہے گی۔[2]

بالآخر یہ خیال اس وقت حقیقت پر منتج ہوا جب انگریزوں نے برصغیر کو تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس طرح 14 اگست 1947 کو جمہوری ملک پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا۔

جب آزادی حاصل ہوئی تو پاکستانی ریاست کو دو مختلف نظریوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ بابائے قوم محمد علی جناح ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک ایسی سیکولر (دنیوی) ریاست کے حق میں تھے، جس کی بنیاد یورپی ریاستی طرز پر ہو۔ دوسری جانب پاکستان کے قومی شاعر علامہ محمد اقبال ایک مختلف نظریے کے حامی تھے۔ انہوں نے پاکستان کے تصور کو خدا کے قانون کے نفاذ سے مشروط کیا۔ اس نظریے نے ملک کو اسلامی ریاست کے روپ میں روشناس کرایا۔ محمد علی جناح کی بے وقت موت نے پاکستان کو چوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ پاکستان کا پہلا متفقہ آئین بمشکل 1956ء تک بن پایا۔ جس میں پاکستان کی اسلامی جمہوری مملکت کے طور پر توثیق کر دی گئی، لیکن صرف اسلام کا نام استعمال کرنے کے علاوہ کوئی قابل ذکر اسلامی تبدیلی متعارف نہ کرائی گئی بلکہ زیادہ تر پرانے برطانوی قانون سے ہی استفادہ جاری رہا۔ ملک میں ہر طرح کی شخصی آزادی تھی اور ازمنہ وسطیٰ کے مذہبی اثرات بدرجہ اتم موجود تھے تاہم 1971ء کے بعد جب ہندوستانی مداخلت سے خانہ جنگی کے نتیجے میں ملک دو ٹکڑے ہوا تو قومی شناخت کے بہاؤ کا ارتکاز مغربی پاکستان کی جانب ہو گیا۔ اس جنگ کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ جناح کے پاکستان کا ہندوستانی مسلمانوں کے لیے علیحدہ ریاست کا تصور اندرونِ خانہ ثقافتی، نسلی اور لسانی تفرقوں پر قابو پانے کے معاملے میں مضبوط ثابت نہیں ہوا۔ ایسے میں ایک مضبوط قومی جذبے کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی اور سیاسی لیڈروں نے قومی شناخت کے لیے مذہب کو مرکزی تعمیری عنصر کے طور پر آگے لانے کی راہ کا انتخاب کیا۔ پاکستان ہندوستانی مسلمانوں کا مادر وطن قرار پایا اور ریاست کو اسلام کی اصل روح کے مطابق مثبت راستے کی جانب راہنمائی کی ضرورت تھی۔ 1973ء کے آئین میں بھی اس بات کی وضاحت کر دی گئی تھی اور یہ پہلا آئین تھا جس میں اسلام کو ریاست کا مذہب قرار دیا گیا۔ آئین میں مذہبی حوالے سے واضح کر دیا گیا تھا۔ جس کے تحت وزیراعظم اور صدر کا مسلمان ہونا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ احمدی اقلیت کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔ مزید برآں حکومت کو عربی زبان کے احیاء سے متعلق سہولیات فراہم کرنے کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ عمومی طور پر مشرقی پاکستان کے سقوط کی وجہ پاکستان کی مشرقی روایات کے جھکاؤ کی سمت عرب دنیا کی بجائے مغرب کی طرف ہونے کو سمجھا گیا۔

ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں 1977ء سے 1988ء پاکستان میں مذہبی معاملات پر کئی اقدامات کیے گئے جس نے قائد اعظم محمد علی جناح کے سیکولر نظریات کو پیچھے دھکیل دیا۔ اب اسلامی جمہوریہ پاکستان (اسلامک ریپبلک آف پاکستان) میں صدارتی نظام رائج ہے اور اسلام کو ریاست کے سرکاری مذہب کا درجہ حاصل ہے لیکن آزاد خیال اور مذہبی حلقوں میں قومی شناخت اور ثقافتی ٹکراؤ کی وجہ سے پاکستانی دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ جنوبی ایشیاء میں ماضی کے معتدل مزاج صوفی خیالات کا حامل اسلام اب دباؤ کا شکار ہو چکا ہے اور گزشتہ تین دہائیوں سے دقیانوسی خیالات پر مبنی نظریات نے زور پکڑ لیا ہے۔

2.2 فوجی دور اور جمہوریت

2- کوہن، اسٹیفن، نظریہ پاکستان (The Idea of Pakistan)، بروکنگز انسٹیٹیوشن، 2004ء، ص 26

پاکستان کا آئینی ڈھانچہ غیر مستحکم سیاسی نظام کی وجہ سے الجھاؤ کا شکار رہا ہے۔ ملک میں فوجی حکومتوں کے تین ادوار گزرے ہیں۔ پہلا دور 71-1958ء تک، دوسرا دور 88-1977ء تک اور تیسرا دور 2008-1999ء میں آیا۔ فوجی

حکومتوں اور عوامی اقتدار کے درمیان تقریباً دس برس کا وقفہ نظر آتا ہے۔ جمہوریت کو مکمل طور پر عوام میں جڑ پکڑنے کا وقت نہیں ملا۔ ریاستی ادارے اور عدالتی نظام کمزور رہا اور جمہوری رویوں نے فروغ نہیں پایا۔ ملک کی سول اور سیاسی قیادت روایتی جاگیرداری ڈھانچے سے بندھی ہوئی ہے اور نچلے طبقے کا سیاسی طاقت کے طور پر ابھرنا ناممکنات میں سے ہے۔ تاہم عام پاکستانیوں میں جمہوریت کو مضبوط کرنے کے حوالے سے مکمل یکجہتی پائی جاتی ہے۔ حالیہ برسوں میں سول سوسائٹی نے اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ طاقتور اور مضبوط ثابت کیا ہے۔ 2007ء کے موسم گرما میں معزول چیف جسٹس کی حمایت اور پرویز مشرف کی فوجی حکومت کی مخالفت میں وکلاء کی تحریک کے دوران لاکھوں افراد نے مظاہرے منعقد کیے۔ پاکستان کے میڈیا خصوصاً بصری اور سمعی اداروں (Electronic Media) نے اس عوامی احتجاج کو پھیلانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

حالانکہ فوج پاکستان کے سیاسی منظرنامے سے پیچھے ہٹ چکی ہے پھر بھی سیاسی معاملات میں ایک متاثر کن کردار کی حامل رہی ہے۔ دفاعی اور خارجہ پالیسی بڑی حد تک فوج کی مشاورت سے ہی بنائی جاتی ہے۔ پاکستان کا ایٹمی پروگرام مکمل طور پر ان کے ہاتھ میں ہے اقتصادی محاذ پر بھی فوج ایک کلیدی کردار ادا کرتی آئی ہے ان کی اپنی صنعتیں اور عسکری کمپلیکس موجود ہیں جو انہیں اقتصادی خودمختاری مہیا کرنے کا باعث ہیں۔[3]

2.3 علاقائی محرکات پاکستان، افغانستان اور دہشت گردی کی جنگ

ریاست میں فوجی حکومت کے کردار کو ہمیشہ اسلامی معاشرتی شناخت کی علامت اور محافظ کے طور پر دیکھا جاتا رہا ہے۔ فوج کے اسلامی جماعتوں کے ساتھ قریبی تعلقات رہے ہیں اور اسلامی انتہاپسندوں کے ساتھ بھی ان کے دیرینہ روابط کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔[4]

ان گروپوں کو انڈیا سے جاری ''پراکسی وار'' میں استعمال کیا گیا۔ جموں وکشمیر اور افغانستان میں ہندوستانی مفادات کے خلاف کام لیا گیا۔ پاکستانی افواج کے نقطہ نظر کے مطابق انڈیا کا وجود پاکستان کی بقا کے لیے مسلسل خطرے کا باعث ہے۔ اس خدشے کے پیشِ نظر عسکری ادارے اس بات کے خواہش مند رہے ہیں کہ مغربی مفادات کا میدان افغانستان کو دو روایتی دشمنوں کے بیچ ترنوالہ نہیں بننا چاہئے اور کابل میں پاکستان دوست یا کم از کم ہندوستان مخالف حکومت اقتدار میں رہے۔

1970ء کی دہائی سے اسی حکمتِ عملی پر عمل کیا جارہا ہے۔ فوجی آمر جنرل ضیاالحق کے دور میں کابل میں روسی مداخلت کے خلاف اور سرد جنگ کے دوران امریکی اتحادی کے طور پر پاکستان نے افغانستان میں نہایت اہم کردار کیا۔ پاکستان، سعودی عرب اور امریکہ کی مشترکہ افغان پالیسی کے تحت مجاہدین کے گروہوں اور جتھوں کو پاکستان نے تربیت دے کر جنگ کے لیے تیار کیا۔ سوویت یونین کی پسپائی کے بعد افغانستان میں امریکی مفادات ختم ہوگئے اور انہوں نے ملک کو مجاہدین اور جنگجوؤں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ تاہم 1990ء کی دہائی کے وسط میں طالبان کے زور پکڑنے کے بعد اور اپنے مفادات کے فروغ کے لیے پاکستان نے ان کی مدد جاری رکھی جو کہ ایک دوست افغان حکومت کو زیر اثر رکھنے کے لیے فوجی حکمت عملی کا حصہ تھا۔

9/11 کے واقعات کے بعد پاکستان کے لیے طالبان کی مدد جاری رکھنا دشوار ہوگیا۔ طالبان حکومت القاعدہ کی بھرپور پشت پناہی میں ملوث تھی اور دہشت گردی کے حوالے سے پھیلے ہوئے جال کو ختم کرنے سے انکار کرتی رہی تھی۔ کچھ عرصے تک حکومتِ پاکستان گومگو کے عالم میں رہی۔ ایک طرف تو طالبان کی مدد کی جارہی تھی اور دوسری جانب القاعدہ تک رسائی حاصل کرنے کی سعی بھی جاری تھی۔ ادھر طالبان سے تعلقات منقطع کرنے کے لیے امریکی دباؤ بڑھتا ہی چلا جارہا تھا یوں بالآخر پاکستانی افواج نے طالبان کی کھلے عام مدد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ تاہم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کوئٹہ بلوچستان میں موجود افغان طالبان راہنماؤں کی سرگرمیوں پر پاکستان نرم گوشہ رکھتا رہا ہے۔

پاکستانی فوج، خصوصاً فرنٹیئر کارپس (FC) پاکستانی طالبان کے ساتھ شدید جھڑپوں میں ملوث رہی ہے۔ یہ وہی

3- عائشہ صدیقہ، ملٹری انک: ان سائیڈ پاکستان ملٹری اکانومی، پلوٹو پریس، 2007

4- حسین حقانی، فوج اور مساجد کے درمیان پاکستان (Pakistan Betwen Mosque & Military) کارنیگی اینڈومنٹ برائے انٹرنیشنل پیس، 2005ء، ص312

عسکریت پسند تھے جن کی کبھی سیکورٹی ایجنسی ISI نے دوسرے نوآموز گروہوں اور افغان جنگ کے دوران سابقہ مجاہدین کے ہمراہ تربیت کی تھی۔ طالبان تحریک یکساں نوعیت کی نہیں بلکہ مختلف ایجنڈے کے تحت کام کر رہی ہے مگر وہ پاکستان میں شرعی قوانین کے نفاذ کے مشترکہ مقصد پر متحد ہیں۔ القاعدہ کے بین الاقوامی جہاد کے تصور نے ان گروپوں کو بے حد متاثر کیا ہے۔ افواج پاکستان کے ساتھ جنگ، پولیس پر حملوں، ریاستی اداروں اور سیاست دانوں کو نشانہ بنانے کو جائز سمجھتے ہوئے انہیں مغربی نوآبادیاتی نظام، آزاد خیالی اور غیر اسلامی جمہوری تہذیب کی باقیات قرار دیتے ہیں۔

پاکستان کی بیشتر آبادی یہ خیال کرتی ہے کہ ان کے ملک کو امریکہ کی جانب سے مسلط کردہ دہشت گردی کی جنگ میں الجھا دیا گیا ہے بہت سے پاکستانیوں کو یقین ہے کہ افغانستان میں بین الاقوامی اور امریکی فوجی دستوں کی موجودگی پاکستان میں بڑھتی ہوئی حالیہ دہشت گردی کی جنگ کی ذمہ دار ہے۔ دوسری جانب امریکہ، انڈیا اور یورپی اقوام ان خدشات سے دوچار ہیں کہ القاعدہ کی جانب سے ہونے والے دہشت گردی کے حملوں میں ملوث افراد کو پاکستان میں واقع دہشت گردی کے کیمپوں میں تربیت دی جاتی ہے۔ اگر پاکستان مزید غیر مستحکم ہوتا ہے تو یہ ناکام ریاست کا روپ دھار لے گا اور دہشت گردوں کی ایسی جنت بن جائے گا جو پورے خطے کو کمزور اور غیر مستحکم کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ پاکستان کے نیوکلیائی ہتھیاروں کی ٹیکنالوجی کی حفاظت سے متعلق کوئی سمجھوتہ کرنا پڑے گا اور ہوسکتا ہے کہ یہ غلط ہاتھوں میں چلا جائے۔ افغانستان میں اپنی فوجی موجودگی کی وجہ سے نیٹو (NATO) ممالک بھی پاکستان سے خدشات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ امریکی اور ایساف (ISAF) کی افواج ملکی سالمیت اور قومی تعمیر و ترقی کے لیے طالبان کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ طالبان کے لیے پاکستان کا قبائلی علاقہ محفوظ پناہ گاہیں تصور ہوتا ہے یہاں سے وہ سرحد کے آر پار افغانستان میں حملے کر سکتے ہیں۔

پاکستان میں سیکورٹی کے اداروں کے اربابِ اختیار کو یقین ہے کہ افغانستان کی موجودہ کرزئی حکومت ہندوستان کی جانب جھکاؤ رکھتی ہے۔ آرمی کے خیال میں وہ دو دیرینہ دشمنوں کے درمیان سینڈوچ بن سکتا ہے۔ پاکستان کے اندر وقوع پذیر ہونے والے حملوں کی نشاندہی نے بہت سے پاکستانیوں بشمول سیاست دانوں اور صدر آصف علی زرداری کو یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ سب سے بڑا خطرہ باہر سے یا ہندوستان کی غیر قانونی سرگرمیوں سے نہیں بلکہ مقامی عسکریت پسندوں اور پاکستانی طالبان کا پیدا کردہ ہے۔ فوجی حلقوں میں اس نظریے سے اتفاق نہیں پایا جاتا۔ جبکہ عوام الناس کی رائے میں بھی سوچ کا فقدان ہے۔ پاکستان آج انہی مسائل سے دوچار ہے جن کا کچھ عرصہ پہلے افغانستان کو سامنا کرنا پڑا تھا یہ رائے کہ افغانستان اور پاکستان کے طالبان کے خلاف جنگ کی وجوہات مشترک ہیں خاصی کمزور دکھائی دیتی ہے مگر اس کے باوجود یہ نظریہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔

2.4 پاکستان کی معاشرتی اور گروہی ساخت

پاکستان کے سماجی ڈھانچے کی جڑیں جاگیرداری نظام میں پیوست ہیں۔ یہی جاگیردارانہ نظام آج بھی اپنی جدید شکل میں دیہاتوں میں باقاعدہ موجود ہے جہاں جاگیرداروں کی زمینیں اور ان کی طاقت کے مراکز قائم ہیں کئی جاگیردار گھرانوں نے سیاست کا رخ کر لیا ہے کچھ نے تو اپنے مفادات کو بچانے کے لیے ایسا کیا ہے جبکہ باقی نے یہ محسوس کیا کہ حکومت کرنا ان کا حق ہے اور انہیں قوم کی خدمت کے لیے آگے آنا چاہیے ان جاگیردار گھرانوں میں سے بھٹو خاندان نے پاکستان کی سیاست میں کئی عشروں سے اپنا قدم جما رکھا ہے۔ صنعت کار گھرانوں میں نواز شریف گھرانے کی طرح کئی نو وارد لوگ آ چکے ہیں مگر ان کی سیاسی حمایت کے مراکز بھی جاگیردار گھرانوں میں ہی ہیں۔

پاکستانی معاشرہ کئی زبانوں، نسلوں اور جماعت بندی کے مختلف گلدستے میں پرویا ہوا ہے۔ ہر صوبے میں مختلف لسانی گروہ اپنا وجود رکھتے ہیں۔ مثلاً سندھ میں سندھی، پنجاب میں پنجابی، بلوچستان میں بلوچ اور پشتون صوبہ سرحد میں آباد ہیں۔ سندھ کی آبادی 46 ملین ہے جبکہ پنجاب آبادی کی شرح کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ ہے اور یہاں بسنے والے افراد کی

تعداد 81 ملین ہے اور روایتی طور پر پاکستان کی فوج اور سیاست میں انہی کا عمل دخل رہا ہے۔ ان چار بڑے نسلی گروہوں کے علاوہ بھی متعدد چھوٹے گروہ موجود ہیں۔ فاٹا (FATA) کے علاقوں میں اکثریتی آبادی کا تعلق پشتون سے ہے یہ لوگ قبیلوں اور چھوٹی بڑی قوموں میں تقسیم ہیں۔

انگریزی پاکستان کی سرکاری زبان ہے اور کاروبار، حکومت اور قانونی رابطوں میں استعمال ہوتی ہے۔ شرفاء اور بالائی متوسط طبقے کے لوگ بھی انگریزی بولتے ہیں اردو قومی زبان ہے اور مختلف نسلی گروہوں کے درمیان بات چیت کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ پنجابی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ دیہاتوں میں بھی کئی زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ مختلف زبانوں کا نسبتی اعداد و شمار کچھ یوں ہے۔ پنجابی 44.68 فی صد، پشتو 15.57 فی صد، سندھی 14.10 فی صد، سرائیکی 8.38 فی صد اور اردو 7.57 فی صد، بلوچی 3.57 فی صد جبکہ 6.3 فی صد دیگر زبانیں بولی جاتی ہیں۔

پاکستان کی آبادی 176 ملین ہے اگر سالانہ آبادی 2 فی سے زائد کی شرح سے اسی طرح بڑھتی رہی تو 2020ء تک 220 ملین تک پہنچنے کی توقع ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کا زیادہ حصہ شہری علاقوں میں آباد ہے اور ایک تخمینے کے تحت ایک آدھ عشرے میں 100 ملین لوگ شہروں میں بس رہے ہوں گے۔[5]

پاکستان میں فی کس آمدنی 840، امریکن ڈالر سالانہ ہے[6] قومی سطح پر خواندگی کی شرح 54 فی صد ہے جس میں مرد 68 فی صد جبکہ خواتین کی شرح 40 فی صد ہے۔[7] دیہی علاقوں میں تو خواندگی کی شرح خاصی کم ہے۔

پاکستان میں اسکولوں کا نظام سرکاری (Public) اور غیر سرکاری (Private) اسکولوں پر مشتمل ہے۔ ملک میں پرائمری اسکولوں میں داخلے کی شرح 62 فی صد ہے دوسرے لفظوں میں 06/2005 میں 5 سے 9 سال کی عمر کے طلبا پرائمری تعلیم حاصل کر رہے تھے (100 فی صد سے مراد عالمی پرائمری تعلیمی شرح کا حصول ہے) 10 سے 12 سال عمر کے طلباء جو 2005ء اور 2006ء میں مڈل۔ ایلمنٹری اسکول میں زیر تعلیم تھے کی شرح 35 فی صد تھی جبکہ ایلمنٹری کے 13 اور 14 سالہ طلباء کی تعداد 23 فی صد رہی۔ 15 اور 16 سال کے 10 فی صد سے قدرے کم شرح ان طلباء پر مشتمل تھی جو ہائیر سیکنڈری اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔[8]

اسکولوں کے نظام کے متوازی 1.5 ملین سے لے کر 2.5 ملین تک طلباء مدارس میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ خواتین مردوں کی نسبت کم پڑھی لکھی ہیں۔ 21 جنوری 2009ء کے روز نامہ ''پاکستان'' کے مطابق فاٹا، صوبہ سرحد اور سوات میں طالبان نے خواتین کی تعلیم حاصل کرنے پر پابندی عائد کرنے کی کوشش کی ہے۔ خبروں کے مطابق 400 غیر سرکاری اسکول جن میں 40,000 طالبات زیر تعلیم تھیں بند کر دیئے گئے ہیں جبکہ سوات میں 169 اسکولوں کو بموں سے اڑا دیا گیا ہے یا پھر جلا دیئے گئے ہیں۔

2.5 مذہب

پاکستان میں تقریباً 97 فی صد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے جس میں 80 فی صد سنی العقیدہ اور 20% شیعہ مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے مذاہب میں ہندو 3,200,000 کی تعداد کے ساتھ 1.85 فی صد، عیسائی 2,800,000 یعنی 1.6 فی صد اور سکھ برادری 0.04 فی صد کے تناسب سے تقریباً 20,000 افراد شامل ہیں۔ 1973ء کے آئین میں تبدیلی کر کے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا تھا، ان کی آبادی تقریباً 2 ملین کے لگ بھگ ہے۔

5- کولن، اسٹیفن، ص 232

6- ورلڈ بینک، ورلڈ ڈیولپمنٹ رپورٹ، 2009ء

7- یونیسکو (UNESCO) کا ادارہ برائے اعداد و شمار www.unesco.org

8- پاکستان میں تعلیمی نظام: قومی تعلیم کے اعداد و شمار کا حساب، یونیسکو اسلام آباد، 2007

3 ذرائع ابلاغ کے کوائف

3.1 نمایاں خدوخال

پاکستان میں میڈیا کا کردار جنوبی ایشیاء کے ممالک کی صف میں خاصا بہترین تصور ہوتا ہے۔ باوجود اس کے کہ اس کو کبھی کبھار سیاسی جماعتوں کی طرف سے سیاسی دباؤ اور حکومتی جماعتوں کی طرف سے براہِ راست پابندیوں کا سامنا بھی رہتا ہے مگر پھر بھی کافی حد تک آزادئ اظہار کے مواقع میسر ہیں۔

تقریباً 40 سے زائد ٹیلی ویژن چینلز طنز و مزاح، موسیقی، فلمیں، مذہبی تقاریر، سیاسی مباحث اور لحہ بہ لحہ کی خبریں نشر کرتے رہتے ہیں۔ اگرچہ بعض اوقات ان پر غیر پیشہ وارانہ اور جانبدار ہونے کی تنقید ہوتی ہے پھر بھی ان ٹی وی چینلز نے پاکستانی میڈیا اور معاشرہ کے لیے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

ریڈیو چینلز بڑی تعداد میں موجود ہیں اور انہیں معلومات کے حصول کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔ خصوصاً دیہاتی علاقوں میں ریڈیو پاکستان جو کہ حکومتی چینل ہے کے علاوہ بھی ایک بڑی تعداد میں دیگر ریڈیو چینلز خبریں اور آزاد صحافتی مواد نشر کرتے ہیں لیکن ان میں زیادہ تعداد موسیقی اور تفریحی پروگرامز کی ہوتی ہے۔ پاکستان میں کثیر اشاعتی اردو کے بڑے اخبارات سے لے کر عام علاقائی پرچے باقاعدگی سے نکلتے ہیں۔

میڈیا کے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ نسلی اور لسانی اور طبقاتی طور پر منقسم معاشرہ واضح طور پر اردو اور انگریزی کی صحافت میں بٹا ہوا ہے اردو صحافت دیہی علاقوں میں پسند کی جاتی ہے جبکہ انگریزی صحافت کا ہدف شہری اور اونچی سوسائٹی کے لوگ ہیں اور یہ اردو کے مقابلے میں زیادہ آزاد خیال اور پیشہ وارانہ ہنر سے مزیّن ہیں انگریزی کے اخبار، ٹی وی اور ریڈیو چینلز کے سامعین و ناظرین کی تعداد ان کے ہم عصر اردو میڈیا کے مقابلے میں نہایت کم ہے لیکن رائے دہندگان، سیاستدانوں، تاجروں اور معاشرے کے اونچے طبقوں میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

انگریزی/ اردو اور دیہی/شہری تقسیم کے علاوہ پاکستانی میڈیا علاقائی زبانوں کی لسانی بنیاد پر پنجابی، پشتو اور سندھی میڈیا کی صورت میں اپنا وجود رکھتا ہے۔

پاکستان کا میڈیا اپنے مالکان کے نظریات سے بھی بہت زیادہ متاثر ہے۔ یہاں تین بڑے بڑے صحافتی ادارے یا صحافتی گروہ موجود ہیں جن کی کسی نہ کسی صورت میں کوئی سیاسی وابستگی ضرور رہی ہے۔ اخبارات اور نشریاتی صنعت دونوں پر ان کے اثر کی وجہ سے یہ صحافتی گروپ سیاست اور معاشرے میں بھی بہت بااثر تصور ہوتے ہیں۔

پچھلے چند سالوں سے صحافیوں کی جان و مال کے تحفظ کے حوالے سے صورتحال انتہائی مخدوش رہی ہے۔ بارہ صحافیوں کو 2003ء میں قتل کر دیا گیا اور مئی 2009ء تک چھ مزید صحافیوں کو قتل کیا جا چکا ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری عہدہ داروں کی جانب سے میڈیا ورکروں کے خلاف جان و مال کی دھمکیوں میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

میڈیا پر بالواسطہ سیاسی دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ حکومت کی طرف سے میڈیا کی مخالفت میں سرکاری اشتہارات کی بندش کو ہتھیار کے طور پر بہت زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ حکمرانوں نے وحشیانہ قوانین کا استعمال کر کے سرکاری طور پر کچھ مقبول ٹی وی چینلز کو بند کر دیا یا پھر خاموش کروا دیا۔ ان چینلوں کو پیمرا کے ذریعہ لائسنس منسوخ کر کے یا ایسا کرنے کی دھمکی دے کر خاموش کروایا جاتا رہا ہے۔ علاوہ ازیں طاقتور سیاسی اور غیر سرکاری قوتوں کو جو موجودہ بحث میں ملوث ہوتی ہیں کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے میڈیا کو ریاستی اداروں کے لیے بطور پروپیگنڈہ استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ مقبول پرائیویٹ ٹی وی چینلز کی نشریات زیادہ تر سیاسی بحث و مباحث اور واقعات پر مرکوز ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ رپورٹیں جن میں معاشرتی مسائل، اقلیتوں کے مسائل،

چھوٹے گروہ، انسانی حقوق اور عورتوں کے حقوق شامل ہیں میڈیا کی بھرپور توجہ حاصل نہیں کر سکتے۔ میڈیا کے دفاع میں کوئی یہ دلیل بھی دے سکتا ہے کہ سیاسی اکھاڑوں میں روز بروز بدلتی صورتحال اور موجودہ بحث ومباحث اتنے زبردست ہیں کہ وہ صحافیوں اور میڈیا کی بھرپور توجہ کے متقاضی ہیں۔

3.2 پاکستانی میڈیا کا تاریخی پس منظر

پاکستانی میڈیا کی تاریخ غیر منقسم برطانوی انڈیا سے شروع ہوتی ہے جب بہت سے اخبارات کا تقسیم کے نظریے اور قومیتوں کو فروغ دینے کے لیے اجراء کیا گیا۔ انگریزی اخبار ''ڈان'' جس کی بنیاد قائداعظم نے رکھی تھی اور پہلا شمارہ 1941ء میں شائع ہوا اسے پاکستان مخالف پروپیگنڈے کا مقابلہ کرنے کے لیے اور آزاد پاکستان کے نعرہ کو فروغ دینے کے لیے استعمال کیا گیا۔ قدامت پسند اخبار نوائے وقت جو کہ 1940ء میں قائم کیا گیا وہ مسلم اشرافیہ کی آواز تھا جو کہ آزاد پاکستان کے زبردست حامی تھے۔ اس تناظر میں پاکستانی میڈیا نظریہ پاکستان کے پرچار کے لیے وجود میں آیا جو کہ برطانوی دور میں مسلم اقلیت کے لیے ہندو اکثریت کی زیادتیوں سے بچنے کا ذریعہ تھا۔ آزادی سے قبل کے اقلیتی کردار اور تقسیم کے دوران نسل کش فسادات کا شکار ہونے کی وجہ سے مزید تین جنگوں کے شاخسانے میں پاکستان کی شناخت کا معاملہ درپیش تھا اور پاکستان آرمی اس شناخت کی وارث بنی اور اس کے کردار کو قومی شناخت کے حوالے سے انڈیا سے سخت رویے، اپنے قومی مذہب اسلام اور قومی زبان اردو کے تحفظ کے ساتھ ساتھ محافظ کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے۔

اسلام کی مرکزی ستون کی حیثیت سے قومی پہچان نے مذہبی رہنماؤں کی فوج، سول بیوروکریسی اور خفیہ ایجنسیوں کے درمیان ایک قومی اتحاد کا کردار ادا کیا ہے۔

قومی نظریات کے حامیوں کے اس گٹھ جوڑ کا میڈیا پر بہت زیادہ اثر ورسوخ رہا ہے کیونکہ انھوں نے اپنے مقاصد کے دفاع اور قومی شناخت کے تحفظ کے لیے میڈیا کے منہ زور گھوڑے کو اپنے قابو میں رکھا۔

مذہبی راہنماؤں نے توہین رسالت قانون کی بہت زیادہ ترویج کی جس سے آزادئ اظہار کا راستہ مسدود ہوا۔ خفیہ ایجنسیوں نے میڈیا کو استعمال کیا اور نوکر شاہی کو صحافتی قوانین کے ذریعے میڈیا کو قابو میں رکھنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ لائسنسوں اور پبلک فنڈ کا اشتہارات کی صورت میں بھی بے دریغ استعمال ہوا۔ مختلف فوجی حکومتوں کی میڈیا کو قابو میں رکھنے میں خصوصی دلچسپی رہی اور میڈیا کے سنسر کے قوانین کے استعمال کے پیچھے بھی یہی عوامل کارفرما تھے۔

میڈیا کے قوانین سب سے پہلے اس دور کے فوجی حکمران فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے متعارف کرائے اس نے 1962ء میں پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈی نینس (PPO) کی بنیاد رکھی اس قانون کے تحت انتظامیہ کو اخبارات ضبط کرنے، خبریں فراہم کرنے والوں پر پابندیاں اور صحافیوں کو گرفتار کرنے کی اجازت تھی۔ مذکورہ قوانین کے استعمال سے ایوب خان نے پریس کے بڑے حصے کو قومیا لیا اور خبروں کے دو بڑے اداروں پر قبضہ کر لیا جبکہ دیگر اداروں کو شدید مشکلات کا شکار کر دیا گیا اور وہ حکومت سے مدد مانگنے پر مجبور ہو گئے۔ ریڈیو پاکستان اور ٹیلی وژن جو کہ 60ء کی دہائی کے وسط میں قائم کیے گئے ان کو بھی حکومت کے سخت ترین کنٹرول میں لے لیا گیا۔ 1980ء میں جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں PPO میں مزید وحشیانہ ترامیم شامل کی گئیں۔ نیوز کے متعلق قوانین میں تبدیلیوں کے تحت کسی بھی خبر پر چاہے وہ حقیقت پر مبنی اور قومی مفاد میں ہی کیوں نہ ہو مگر انتظامیہ کی پسند کے معیار کے خلاف ہو تو اس کے لیے پبلشرز کو جوابدہ ہونا پڑتا تھا۔

ان ترامیم کو ضیاء کی اسلامی تعلیمات کے فروغ اور فوج اور علماء کے اتحاد کے اظہار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ ضیاء کے دور میں سنسر شپ براہِ راست بہت سخت اور آمرانہ تھی۔ اخبارات کی مکمل جانچ پڑتال کی جاتی اور تلخ مضامین یا ناپسندیدہ سطروں کو کاٹ دیا جاتا۔ ضیاء کی اچانک موت اور جمہوریت کی واپسی کے سبب ان ظالم قوانین (PPO) کی سختی میں کمی کی راہ

ہموار ہوگئی۔

2002ء میں جنرل مشرف کے دور میں میڈیا کو زبردست ترقی ملی۔ اس دور میں پاکستانی الیکٹرانک میڈیا ایک بلندی تک پہنچا اور سیاسی میدان میں تبدیلی کی نوید سنائی دی۔ نئے قوانین نے الیکٹرانک میڈیا پر حکومتی اجارہ داری کو ختم کر دیا۔ ٹی وی نشریات اور ایف ایم ریڈیو کے لائسنس نجی اداروں کو دے دیئے گئے۔

میڈیا کے لائسنسوں کو آزاد کرنے کے پیچھے یہ خواہش کارفرما تھی کہ پاکستانی میڈیا قومی سلامتی کو مضبوط کرنے اور بھارت کی طرف سے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکے گا۔ میڈیا کے ساتھ فوج کے پچھلے ادوار کی تلخیوں نے بھی اس نظریے کو تقویت بخشی۔ کارگل کی جنگ اور پاکستانی عسکریت پسندوں کے ہاتھوں انڈین ایئر لائین کے جہاز کے اغوا کے واقعات میں پاکستانی افواج نے یہ محسوس کیا کہ میڈیا کے محاذ پر وہ انڈیا سے شکست کھا گئے ہیں۔ حکومت خفیہ ایجنسیاں اور فوج سب کا یہی موقف تھا کہ پاکستان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ پاکستانی میڈیا بھی ہندوستانی ذرائع ابلاغ کی ہمسری کرے۔ مستقبل میں بہترین صلاحیتوں والے الیکٹرانک میڈیا کی ضرورت محسوس کی گئی اور اس طرح الیکٹرانک میڈیا کو آزادی دے دی گئی جس کی واضح توجیح صرف انڈین میڈیا کی طاقت سے مقابلہ بیان کی گئی اور اس کے لیے اس احترام کو ملحوظ خاطر رکھا گیا کہ جدید معاشروں میں میڈیا کو جتنے حقوق حاصل ہیں ویسا ہی یہاں بھی منصوبہ سازی کی گئی۔ فوج یہ سوچ رہی تھی کہ وہ اب بھی میڈیا پر قابو پا سکتی ہے اور اسے کسی وقت بھی ایسی لگام دی جا سکتی ہے جسے حکمران قومی مفاد کا نام دیتے آئے ہیں اور مطلوبہ سیاسی ایجنڈے کے مطابق اس کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔

مگر یہ اندازے غلط ثابت ہوئے کیونکہ میڈیا اور بالخصوص نت نئے ٹی وی چینلز معاشرہ میں ایک زبردست قوت بن کر ابھرے اور انھوں نے مشرف کے اقتدار اور حکومت کے خاتمے میں نہایت فعال کردار ادا کیا۔ میڈیا نے سول سوسائٹی کے کردار کو فعال بنا کر متحرک کیا اور 2007ء میں چیف جسٹس کی بحالی کی وکلا تحریک کی مسلسل کوریج کی۔

یہ احتجاجی تحریک جس میں لاکھوں افراد عدلیہ کی آزادی اور جمہوری حکومت کے قیام کے لیے سڑکوں پر نکلے۔ جس کی وجہ سے جنرل مشرف کی سول سوسائٹی اور فوج میں حمایت کم ہوتی گئی بالآخر اسے مجبور ہو کر الیکشن کروانے پڑے۔ حال ہی میں سول سوسائٹی کے اداروں، وکلاء تحریک اور الیکٹرانک میڈیا کے درمیان تعاون کی وجہ سے صدر آصف علی زرداری نے عوامی اور سیاسی دباؤ پر چیف جسٹس کو مجبور ہو کر بحال کر دیا ہے۔ طاقتور سول سوسائٹی کا ظہور پاکستانی تاریخ کا انوکھا واقع ہے جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی یہ لوگ بھی میڈیا کے بغیر طاقتور نہیں ہو سکتے۔ اگر پاکستان کو ایک مضبوط جمہوریت بننا ہے تو میڈیا کو اپنا کلیدی کردار جاری رکھنے کی ضرورت ہوگی۔

کرسٹائن فیئر جو کہ رینڈ کارپوریشن میں سینئر سیاسی تجزیہ نگار ہیں اور جنوبی ایشیا کے سیاسی اور فوجی معاملات کی ماہر ہیں ان کا کہنا ہے کہ ''پاکستان کے لیے واحد امید یہ ہے کہ میڈیا لوگوں کو متحرک کرے۔ میڈیا نے پہلے بھی بہت زبردست کام کیا ہے، اس کے باوجود کہ کبھی کبھار انہوں نے غیر پیشہ وارانہ رویہ بھی اختیار کیا کیونکہ انہیں سیاسی عزائم اور صحافت کے مابین توازن کے پہلو کو مدنظر رکھنا ہوتا تھا۔''(9)

کیا پاکستانی میڈیا اپنے طاقتور ٹی وی چینلز کی مدد سے اتنی بڑی ذمہ داری نبھانے اور اپنے اندر تبدیلیاں لانے کے قابل ہے۔ اس تمام کا انحصار عمومی حالات کار کو بہتر بنانے پر ہے جو کہ افواج اور سرکاری نوکر شاہی، صحافیوں کی حفاظتی صورتِ حال میڈیا سے متعلق قوانین میں ردوبدل، بہتر صحافیانہ تربیت اور سب سے آخر میں میڈیا اور میڈیا مالکان کی اپنی مرضی پر منحصر ہوگا۔

9- کرسٹائن فیئر، سینئر سیاسی تجزیہ نگار اور ماہر سیاسی اور فوجی معاملات برائے جنوبی ایشیاء بمقام رینڈ کارپوریشن ہیں۔ انٹرویو کے اقتباس weekendavisen کی 20 اپریل کی اشاعت 1,5,8 سے لیا گیا ہے۔

3.3 قانونی ڈھانچہ

اگرچہ پاکستانی میڈیا اپنے دیگر پڑوسی ساؤتھ ایشین ممالک کے میڈیا سے نسبتاً زیادہ آزاد ہے لیکن اس کے باوجود اس

شعبے کو غیر جمہوری اور قدامت پرست قوانین اور ضابطوں کا سامنا ہے۔

ملک کو مسلسل بدلتی ہوئی فوجی اور جمہوری حکومتوں کا سامنا تھا مگر پھر بھی جمہوری اقدار غیر محسوس طریقے سے پنپتی رہیں۔ گو پاکستانی میڈیا کو سخت گیر حکومتوں اور فوجی آمریت کے ماتحت کام کرنا پڑا۔ میڈیا کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے بہت سارے قوانین اور ضابطے بنائے گئے مگر اس کی زبان بندی نہ ہو سکی۔ یہ قوانین اگرچہ جمہوری اقدار سے میل نہیں رکھتے اور مستقبل میں پاکستانی میڈیا اور جمہوریت کے لیے ایک ممکنہ خطرے کی حیثیت برقرار رکھیں گے۔

آئین

پاکستان کا آئین فعال جمہوریت میں بنیادی حقوق کی ضمانت دیتا ہے اور آزادئ اظہار اور میڈیا کی آزادی کا آئینی جواز فراہم کرتا ہے۔ آئین اسلام کے دائرے میں حکومتی کردار کی وضاحت کرتے ہوئے شہریوں کے بنیادی حقوق کی جمہوری حکومت میں دستیابی ان کا پیدائشی حق تسلیم کرتا ہے۔

''بنیادی حقوق بشمول قانون کی نظر میں برابری اور معاشرتی، اقتصادی، سیاسی انصاف اور آزادئ سوچ، اظہار، مذہب، عبادات اور تنظیم جو کہ قانون اور اخلاقیات کے منافی نہ ہوں ان کی ضمانت ہوگی۔''

تاہم پھر بھی بارہا آئین اور جمہوری حکومتوں کو اقتدار سے الگ کیا جاتا رہا اور اپنے وجود میں آنے سے لے کر یہ ملک نصف عرصے سے زائد فوجی آمریت کے زیر تسلط رہا۔

جناب ایم ضیاء الدین جو کہ میڈیا میں قانون سازی کے حوالے سے سرگرم ہیں، کا کہنا ہے ''انہی وجوہات کی بنا پر ملک میں بنیادی جمہوری اقدار کو شدید نقصان پہنچا مگر پھر بھی ملک اس اندھیرے دور میں اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہا اور اپنی متروک شدہ سیاسی و سماجی اقدار کو بحال کرنے میں کامرانی حاصل کی۔ میڈیا کا اس عمل میں کلیدی کردار رہا ہے۔

حتیٰ کہ فوجی حکمرانی کے بدترین دنوں میں بھی یہ میڈیا ہی تھا جس نے ملک اور اس کے مستقبل کی امید کو زندہ رکھا۔ ملک کا کوئی دوسرا ادارہ بشمول سیاسی جماعتیں اور سول سوسائٹی حتیٰ کہ عدلیہ بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کیونکہ جب بھی دیگر دروازے بند کیے گئے یہ صرف اور صرف میڈیا ہی تھا جس نے ان لوگوں کے لیے پنپنے کے مواقع فراہم کیے اور جو بدترین آمر کے خلاف آواز بلند کرنے پر آمادہ تھے۔

میڈیا کے قوانین

وقت کے ساتھ ساتھ ایک کثیر تعداد میں قوانین اور نظام متعارف کرائے گئے۔ جنہوں نے براہِ راست میڈیا کو متاثر کیا۔ (PPO) جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے اس کے ساتھ ساتھ آزادی اطلاعات کا قانون 2002ء، پیمرا 2002ء ازالۂ حیثیت عرفی کا قانون 2002ء، توہین عدالت کا 2003ء کا قانون، پریس اخبارات، اخباری ایجنسیوں اور کتابوں کی رجسٹریشن کا قانون 2003ء پریس کونسل کا آرڈی نینس 2005ء اور سب سے آخر میں معلومات تک رسائی کا 2006ء کا قانون سامنے آیا۔ اس کے علاوہ بھی 2006ء میں ظاہراً بہت سی مزید قانون سازی کی کوششیں کی گئیں تاکہ اخبارات جرائد، خبروں اور اشتہاری ایجنسیوں کی رجسٹریشن کو ضروری بنایا جا سکے اور اخبارات و جرائد کی اشاعت کے اعداد و شمار کو درست انداز میں ممکن بنایا جائے۔ (اسے PARRA کا نام دیا گیا۔)

2002ء میں میڈیا کی آزادی کو قوانین کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ میڈیا کو آزادی ملتے ہی مارکیٹ میں بہت سے ٹی وی چینلز آ گئے۔ متعدد ٹی وی اور سٹیلائٹ چینل کے آپریٹرز نے کام شروع کر دیا جن کی اعلیٰ حکام کی جانب سے کوئی نگرانی نہ کی گئی۔ گورنمنٹ نے محسوس کیا کہ لامحدود تعداد میں بڑھنے والے کیبل ٹی وی کے کاروبار کو ''باقاعدہ'' شکل نہ دے کر وہ کروڑوں

روپے سے محروم ہو رہی ہے۔ چنانچہ 2002ء کی قانون سازی کی بہت سی وجوہات میں ایک یہ وجہ بھی تھی کہ مشرف نے حکومت سنبھالتے ہی جلد بازی میں انہیں جاری کیا جس میں زیادہ تر قوانین جمہوریت مخالف تھے اور ان کو لاگو کرنے کا مقصد لوگوں کو متحرک کرنا نہیں بلکہ انہیں لگام دینا تھا۔ میڈیا کے کئی حمایتی یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ نئے قوانین بہت مبہم تھے اور ان کی تشریح صرف عدالت کے ذریعے ہی ممکن تھی۔

PEMRA۔ساجھی سے نگہبان تک

پیمرا کو حکومت نے ایک کھلی میڈیا پالیسی اور اصلاحات کے حوالے سے تقویت دی اور اس کو باقاعدگی سے فعال بنانے کے لیے مضبوط دانتوں سے مسلح کیا لیکن درحقیقت یہ ملک میں میڈیا کی آزادی کے لیے ایک بڑی رکاوٹ تھی۔

پیمرا کا قیام دراصل 2002ء میں میڈیا کے نشریاتی اداروں کے لیے ریگولیٹری اتھارٹی بنانے سے شروع ہوا جب اسے معلومات کے معیار کی بہتری کے علاوہ تعلیم اور تفریح کے حوالے سے کام تفویض کیے گئے۔ تاکہ خبروں، معلوماتِ عامہ، مذہبی علوم، فن، ثقافت، سائنس، ٹیکنالوجی، معاشی ترقی، معاشی معاملات، موسیقی، کھیل، ڈرامہ اور دیگر عوامی اور ملکی دلچسپی کے موضوعات پر لوگوں کو میسر انتخاب کو بڑھانے کے لیے کام کیا جائے اور ذمہ داریوں اور طاقت اور معلومات پر دسترس کو عمومی درجے تک رسائی اور شراکتِ اقتدار کو نچلی سطح تک منتقل کرنا اور بالآخر احتساب شفافیت اور گڈ گورننس کی معلومات کا نچلے درجے تک آزادانہ بہاؤ کو یقینی بنانا شامل تھا۔

موجودہ جمہوری دور سے پہلے کی بہت سی جماعتیں نشریاتی اداروں کے لیے اسے جمہوری عمل کے لیے ایک مضبوط بنیاد تصور کرتے رہے۔ جبکہ میڈیا کے افسرانِ بالا کی عمومی رائے یہ ہے کہ پیمرا نے صرف لائسنس جاری کرنے کے ایک ایسے دفتر کی حیثیت سے کام شروع کیا ہے جسے میڈیا کے لیے اصلاحاتی رکاوٹیں کھڑی کرنے کا ادارہ تصور کیا جائے گا۔ میڈیا کے لیے قانونی جنگ لڑنے والے صحافی مطیع اللہ جان نے لکھا کہ ''یہ نشریاتی اداروں سے قانونی طریقے سے بھتہ وصول کرنے کا ایک ادارہ ہے۔''

پیمرا قوانین کو مشرف حکومت نے میڈیا کو قابو میں رکھنے کے لیے استعمال کیا۔ ان قوانین کے استعمال کے ذریعے بعض چینلز کو بند اور بعض کو ڈرایا دھمکایا جاتا رہا۔ اس ادارے کی بارہ رکنی کمیٹی میں زیادہ تر ارکان بیوروکریٹ یا سابق پولیس افسران تھے۔ یہ صورتحال موجودہ حکومت کے اقتدار سنبھالنے کے ساتھ کچھ تبدیل ہوئی ہے۔ لیکن میڈیا کے ماہرین بھی اس بارہ رکنی کمیٹی کی تشکیل سے مطمئن نہیں وہ اس کمیٹی میں میڈیا کے نمائندگان کی زیادہ شمولیت پر زور دیتے آئے ہیں۔ مطیع اللہ جان کہتے ہیں کہ ریڈیو اور ٹی وی میں اصلاحات کے لیے میڈیا کی شمولیت ان کے نمائندوں کے ذریعے ہی ہونی چاہیں اور پیمرا بورڈ کو آزاد اور ممتاز لوگوں کی شمولیت سے نئی بنیادوں پر تعمیر کیا جائے۔ یہ ابھی تک بیوروکریٹ اور سابق پولیس افسران پر ہی مشتمل ہے اور اس میں میڈیا کے مالکان کی نمائندگی میں کمی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

پیمرا حکام اس بات سے متفق ہیں کہ اس ادارے میں میڈیا کے لوگوں کو بھی شامل کیا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر عبدالجبار جو کہ پیمرا کے ایگزیکٹو ممبر ہیں ان کا کہنا ہے ''تنظیم نگرانوں اور میڈیا کے ارباب اختیار کا امتزاج ہے اس لیے یہ نگران میڈیا اور قانون سے وابستہ افراد کی ایک زنجیر ہے۔''

تاہم موجودہ حکومت پر ان قوانین کو تبدیل یا منسوخ کرنے کے لیے بہت دباؤ ہے۔ بہت سارے میڈیا کے ماہرین نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ مشرف دور میں اس کے ظالمانہ انداز کی طرح ابھی تک اس کا استعمال نہیں کیا گیا۔ پیمرا بورڈ کی کسی حد تک تنظیم نو کر دی گئی ہے اور میڈیا کے چند پیشہ ور لوگوں کو بھی نمائندگی حاصل ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت نے نئے سرے سے کچھ جمہوری روایات اور میڈیا قوانین کی اصلاحات متعارف کرانے کی یقین دہانی کرائی ہے۔

پیمرا کی طرف سے بنائے گئے مجموعۂ قوانین کو میڈیا کی صنعت سے وابستہ لوگوں کی تنقید کا سامنا ہے اور اب حکومت اس پر نظر ثانی بھی کر رہی ہے۔ سابق وزیر اطلاعات نے پاکستانی نشریاتی اداروں کی ایسوسی ایشن سے ایک نئے کوڈ آف کنڈکٹ کا مسودہ تیار کرنے کی درخواست کی تھی تاکہ پیمرا کے موجودہ ضابطۂ اخلاق کو تبدیل کیا جا سکے۔

ابھی تک پیمرا حکام نے اس معاملے پر آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالجبار کا ضابطہ اخلاق کے مسئلے پر یہ کہنا ہے کہ ''اس وقت متعدد Code of Conducts موجود ہیں جن میں ایک PFUJ، دوسرا SAFMA جبکہ نشریاتی اداروں کے ماہرین ایک اور ضابطہ اخلاق بنانے کے عمل میں مصروف ہیں یقیناً حکومت ان تجاویز سے اتفاق نہیں کرے گی لیکن ان تمام مندرجات کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت ایک جامع دستاویز تیار کرے گی جو کہ تمام پارٹیوں کے لیے قابل قبول ہو اور جس کے ہر ایک کے پاس مالکانہ حقوق ہوں گے۔

انھوں نے مزید کہا کہ پیمرا کام کرتی رہے گی، اس کو خاموش یا ختم نہیں کیا جائے گا۔ ہم ہی اسے چلائیں گے۔ لیکن میڈیا کے لوگوں کی آواز بھی اس میں شامل ہوگی۔ اسے ہم سیلف ریگولیشن کہہ سکتے ہیں۔''

پریس کونسل اور نیوز پیپر ریگولیشن

اسے اکتوبر 2002ء میں پریس کونسل آف پاکستان کے ماتحت قائم کیا گیا۔ یہ نیم خودمختیار کونسل کے تحت ایک اخلاقی ضابطہ تھا جس پر جنرل مشرف نے دستخط کیے۔ اسے پریس کی آزادی سے لے کر ضابطے کے نظام تک حفاظت اور عوامی شکایات پر نظر ثانی تک گوناگوں اختیارات تفویض کیے گئے ہیں۔

تاہم میڈیا کے تحفظات کی وجہ سے پریس کونسل نے کبھی بھی کوئی کام نہیں کیا۔ اس کے قیام پر احتجاج کی وجہ سے پیشہ ور صحافتی تنظیموں نے اپنی نمائندگی کے لیے چار ارکان کے نام تجویز کرنے سے گریز کیا ہے۔ اس کے باوجود بھی ایک چیئرمین کا تقرر ہوا، اب دفاتر بھی موجود ہیں اور عمومی انتظامی نوعیت کا کام بھی جاری ہے تاہم حکومت کو پریس کونسل کے سارے نظام پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔

پریس کونسل آرڈیننس کا براہ راست تعلق پریس، اخبارات، خبروں کی ایجنسیوں اور کتابوں کی رجسٹریشن آرڈیننس برائے 2002 (PNNABRO) سے ہے یہ قانون سازی اشاعت کی رجسٹریشن کے عمل اور میڈیا کی ملکیت کے طریقہ کار سے متعلق ہے۔

اخبارات میں اشاعتی دستاویزات کے لیے ''ڈیکلریشن'' کے لیے ایڈیٹروں کی جانب سے یہ ضمانت بھی شامل ہوگی کہ وہ ان اخلاقی ضابطوں کی پابندی کریں گے جو پریس کونسل آف پاکستان آرڈیننس میں شامل ہیں۔ گو کہ پریس کونسل کے کام کو خاموش یا معطل کر دیا گیا ہے لیکن ان باہمی یکساں قوانین سے حکومت کو اخبارات کے خلاف پابندیاں عائد کرنے اور وحشیانہ قوانین استعمال کرنے کے نئے ذرائع میسر آ جائیں گے۔ PNNABRO دیگر دستاویزات کے علاوہ پبلشرز سے ان کے بینک کھاتے کی تفصیل بھی طلب کرتا ہے اور رجسٹریشن کے عمل کے لیے بہت سخت کنٹرول اور ضابطے موجود ہیں۔ یہ نہ صرف وسائل کی تفصیل مانگتا ہے بلکہ ایڈیٹرز اور خبریں دینے والوں کے متعلق تفصیلی معلومات بھی طلب کرتا ہے۔

اشاعت کے ملکیتی حقوق (زیادہ تر اخبارات اور اخباری ایجنسیاں) صرف پاکستانی شہریوں کو ہی دیے جاتے ہیں تاکہ حکومت کی طرف سے کوئی خصوصی اجازت نامہ نہ ہو۔ شراکت داری میں غیر ملکی شمولیت 25 فی صد سے زیادہ نہ ہو۔ قانون کسی غیر ملکی کو ڈیکلریشن حاصل کرنے نیوز ایجنسی چلانے یا کوئی میڈیا اسٹیشن قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

3.4 پاکستانی ذرائع ابلاغ

پرنٹ میڈیا

پچھلے عشرے میں میڈیا کے حوالے سے پاکستانی مارکیٹ میں زبردست تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ 1997ء میں روزناموں، ماہناموں اور دیگر چھوٹے پرچوں کی تعداد 4455 تھی لیکن 6 سال بعد 2003ء میں یہ ہی تعداد کم ہوکر 945 رہ گئی۔

البتہ اسی دور میں اشاعت میں اضافہ بھی دیکھنے میں آیا۔ 2003ء میں یہ تعداد روزانہ کی بنیاد پر 6.2 ملین تک پہنچ گئی۔ اس میں ایک بہت بڑی تعداد عام اشاعتوں کی بھی شامل ہے۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف پیس سٹڈیز کے مطابق اس میں 142 مخصوص اخبارات ہیں۔ یہ اعداد وشمار قطعی نہیں ہیں۔ انگریزی اخبار ڈان کے نیوز ایڈیٹر ظفر عباس کے مطابق اس وقت تمام اخبارات کی اشاعت 4 ملین کے لگ بھگ ہے۔

پرنٹ میڈیا پاکستان میں سب سے پرانا میڈیا ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت ملکی آزادی سے بھی قدیم ہے۔ ایک عرصہ تک اخبارات کو ہی واحد غیر سرکاری میڈیا کی حیثیت حاصل رہی جس نے حکام کے خلاف ایک آزادانہ اور تنقیدی نکتہ نظر اپنایا۔ پرنٹ میڈیا 11 مختلف زبانوں میں چھپتا ہے جس میں اردو اور سندھی سب سے بڑے گروپ کا حصہ تصور ہوتے ہیں۔ انگریزی اخبارات کی اشاعت کم ہے پرنٹ میڈیا میں یہ تقسیم کچھ یوں ہے۔ اردو اخبارات کو دیہی علاقوں میں زبردست پذیرائی حاصل ہے یہ اخبارات قدامت پسند، عوامی، مذہبی اور سنسنی خیز ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر عوام میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اور اپنا حلقہ اثر رکھتے ہیں۔ انگریزی میڈیا شہری علاقوں میں اثر رکھتا ہے جو اشرافیہ سے متعلق ہیں۔ یہ زیادہ آزاد خیال اور پیشہ وارانہ اہمیت کا حامل ہے۔ انگریزی پرنٹ میڈیا فیصلہ کنندگان سیاستدانوں، تاجروں اور معاشرے کے اوپر والے طبقے پر اثر انداز ہوتا ہے۔

پرنٹ میڈیا مارکیٹ میں خصوصاً اور عمومی طور پر میڈیا مارکیٹ میں تین اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جنگ گروپ آف نیوز پیپر، پاکستان کا سب سے بڑا میڈیا گروپ ہے اور یہ روزنامہ جنگ، دی نیوز انٹرنیشنل ہفت روز میگ اور عوام کی اشاعت کرتا ہے۔ اس گروپ کا جھکاؤ متوازن قدامت پسندی کی جانب دیکھا گیا ہے۔

ڈان گروپ آف نیوز پیپرز، پاکستان کا دوسرا بڑا میڈیا گروپ ہے اور اس کی اشاعتی صف میں سٹار، ہیرالڈ اور ڈان اخبار شامل ہیں۔ ڈان ایک آزاد خیال غیر مذہبی اور متوازن خیالات کا میڈیا گروپ تصور کیا جاتا ہے۔ سٹار پاکستان کا سب سے زیادہ مقبول شام کا اخبار ہے جبکہ ہیرالڈ معلومات عامہ پر مبنی ماہ نامہ ہے۔

نوائے وقت بھی اردو زبان میں شائع ہونے والا ایک بہت بڑا اخبار ہے۔ اندرون ملک اسے پڑھنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ یہ نوائے وقت گروپ کا اخبار ہے جو کہ انگریزی اخبار دی نیشن بھی شائع کرتا ہے۔ دی نیشن کی طرح نوائے وقت بھی دائیں بازو کا قدامت پرست اخبار تصور ہوتا ہے۔ اس کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر جاوید صدیق کے مطابق یہ اخبارات جمہوریت اور ایک رفاہی اسلامی ریاست کے قیام کے لیے کام کر رہے ہیں۔

آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی (APNS) تمام بڑے اخبارات اور اخباری مالکان کی نمائندہ ہے اور اس میں بڑے گروپوں کی اجارہ داری ہے۔ APNS کو 1953ء میں اس وقت کے اہم ایڈیٹروں اور پبلشرز کے مابین تبادلہ خیالات کے لیے اخبارات کے حقوق کے تحفظ کی خاطر قائم کیا گیا۔ آج کل اس تنظیم کا بنیادی مقصد اپنے ممبران کے کاروباری مفادات کا تحفظ ہے۔ اگر کوئی اشتہار دینے والا رقم کی بروقت ادائیگی نہ کر سکے تو متعلقہ اخبار کو شکایت کرتا ہے اور وہ اپنے 243 ممبران

کے ساتھ اس کمپنی یا ایجنسی کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ رقم ادا کرے ورنہ اسے پابندی کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔

ٹی وی

پاکستان ٹی وی کی نشریات 1964ء میں شروع ہوئیں۔ پی ٹی وی کے 6 چینلز ہیں ان میں سے ایک پی ٹی وی گلوبل ہے جس کی نشریات یورپ، ایشیاء اور امریکہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ پی ٹی وی نیوز صرف خبروں سے متعلق چینل ہے اور پی ٹی وی نیشنل مختلف پاکستانی زبانوں میں پروگرام نشر کرتا ہے۔ 2003ء میں جب الیکٹرانک میڈیا کی پالیسی کو آزاد کیا گیا تو اس کی حکومتی اجارہ داری ختم ہوگئی۔ یہ بات پرائیوٹ چینلز کی بھرمار کی وجہ بنی جو آج کل ایسے لاکھوں ناظرین کو طنز و مزاح کے پروگرام، خبریں، ڈرامے اور گفت وشنید کے پروگرام دکھاتے ہیں۔

پرائیوٹ ٹی وی چینلز کو صرف کیبل یا سٹلائیٹ نشریات کا لائسنس دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پی ٹی وی ہی واحد چینل ہے جس کے پاس زمینی نشریات لوگوں تک پہنچانے کے حقوق ہیں۔ یہ پی ٹی وی کے مفاد میں بھی ہے، زیادہ تر دیہی آبادی کے پاس متبادل چینلز کی سہولت موجود نہیں جو کہ کیبل یا سیٹلائیٹ کے ذریعے نشریات فراہم کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت اب بھی پرائیوٹ ٹی وی چینلز کو کنٹرول کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔ جیسا کہ کیبل کنکشن اور سیٹلائیٹ نشریات آسانی سے کسی وقت بھی بند کی جاسکتی ہیں۔ حکومت نہ صرف اپنی شرائط پر میڈیا کو آزادی دینا چاہتی ہے بلکہ میڈیا کو قومی مفادات کی مضبوطی کی خاطر ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہے۔ یہ بات اس سے بھی عیاں ہے کہ پبلک ایڈورٹائزمنٹ کا بجٹ حکومت ہی مختص کرتی ہے۔ پی ٹی وی اس بجٹ کا 70 فی صد وصول کرتا ہے۔ باقی بچ جانے والا حصہ ان آزاد ٹی وی چینلز میں تقسیم ہوتا ہے جن کی ہمدردیاں حکومت کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ماضی میں یہ مختص شدہ بجٹ بھی واپس لے لیا جاتا تھا تاکہ یہ غیر سرکاری چینلز اپنی تنقیدی روش اور پالیسی تبدیل کریں۔

ٹی وی سیکٹر ہمیشہ فعال رہا۔ پاکستان میں کل ملا کر 49 ٹی وی چینلز ہیں جن میں سے 15 خبروں کے چینلز ہیں۔ بنیادی طور پر 32 تفریح کے اور 2 مذہبی چینلز ہیں۔ تینوں بڑے گروپوں کے اپنے ٹی وی چینلز بھی ہیں۔ مگر نئے آنے والوں جیسے اے آر وائی ٹی وی اور آج ٹی وی نے ان کی غالب حیثیت کو چیلنج کیا ہوا ہے البتہ ہارون گروپ اب بھی 24 گھنٹے چلنے والے ڈان نیوز کا مالک ہے جو کہ شہری اشرافیہ میں بہت مقبول ہے۔

جیو ٹی وی جو کہ انڈیپنڈنٹ میڈیا کارپوریشن کی ملکیت ہے۔ یہ جنگ گروپ آف نیوز پیپر سے منسلک ہے یہ جیو نیوز اور جیو ٹی وی کا بیڑہ ہے۔ اردو چینل پاکستان میں بہت مقبول ہے اس کے ناظرین بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ تاہم جیو بھی کیبل کا ٹی وی ہے جسے زمینی ٹی وی پر دسترس نہیں۔ جیو ٹی وی کو بھی دوسرے ٹی وی چینل کی طرح حکومت کی اس تنقید کا سامنا رہتا ہے کہ وہ واقعات کو بڑھا چڑھا کر یا حقائق کو توڑ موڑ کر پیش کرتا ہے۔ اس چینل کو کئی مرتبہ تو بند کر دیا گیا یا پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب ''مشرف نے 2007ء کے تاریک لمحات میں ایمرجنسی کا نفاذ کیا تو جیو ٹی وی کو 16 نومبر کو دبئی کے مقامی حکام کی طرف سے احکامات موصول ہوئے کہ وہ اپنے تمام پروگراموں کی براہ راست نشریات بند کر دے۔ جیو ٹی وی پر یہ بھی پابندی لگا دی گئی کہ وہ اپنے مقبول میزبانوں ڈاکٹر شاہد مسعود اور حامد میر کے پروگرام نہیں دکھا سکتا۔

حال ہی میں مارچ 2009ء میں جیو ٹی وی کی نشریات کئی بڑے شہروں میں روک دی گئیں۔ یہ اقدام صدر آصف علی زرداری اور پی پی کی حکومت نے وکلا کے لانگ مارچ کو روکنے کے لیے جو کہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی کی خاطر حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے شروع کرنا تھا سے پہلے کیا۔ اس پابندی کے نتیجے میں وزیر اطلاعات شیری رحمان جو کہ خود صحافی بھی ہیں مستعفی ہوگئیں۔

جیو نیوز کو وکلاء کی تحریک کی کوریج اور وقت کی حکومت پر مسلسل تنقید کی وجہ سے نشانہ بنایا گیا۔ اگرچہ یہ تنقید درست تھی اور

جمہوری روایات اور اصولوں پر مبنی تھی۔ اسے سیاسی جانبداری برتنے پر بھی تنقید کا سامنا رہا۔ علامہ اقبال یونیورسٹی کے شعبہ ابلاغ عامہ کے سید عبدالسراج کے مطابق جنگ گروپ اور نظامی گروپ مسلم لیگ (ن) کی طرف داری کرتے ہیں جبکہ ہارون گروپ پی پی کی حمایت کرتا ہے۔

جیو نیوز ہی واحد ادارہ نہیں تھا جسے ہراساں کیا گیا۔ دوسرے مشہور نیوز چینل کو بھی آزادی صحافت اور مخصوص سیاسی نظریات یا جانبدارانہ رویے بڑھانے کی تنقید کا سامنا رہا۔ ٹی وی چینل کے مابین اپنے ناظرین کی تعداد بڑھانے کا شدید مقابلہ رہتا ہے۔ اس سے بہت زیادہ سنسنی خیزی پھیلتی ہے۔ یہ نیوز چینل سیاسی تبدیلیوں کی لحہ بہ لحہ صورتحال نشر کرتے ہیں اور ان پر یہ تنقید کی جاتی ہے کہ ایسے موضوعات پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں جن کو یہ ڈرامے کی شکل دے کر اپنے سامعین کی تفنن طبع کا بندوبست کرتے ہیں۔

ریڈیو

پاکستان میں ریڈیو بہت فعال ہے اور اسے دیہی علاقوں میں جہاں پر نشریات مہنگے اخراجات کی وجہ سے یا محض دیہاتی گھروں میں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے نہیں پہنچ پاتیں وہاں ریڈیو کو برتری حاصل ہے۔ شہری علاقوں میں ریڈیو مقبولیت حاصل کر رہا ہے کیونکہ لوگ اتنے مصروف ہو گئے ہیں کہ ان کے پاس ٹی وی دیکھنے کا وقت نہیں ہوتا وہ اکثر کام سے آتے جاتے سفر کے دوران ریڈیو سن لیتے ہیں۔ پاکستان میں ریڈیو پر حکومتی اجارہ داری تھی۔ جب 2002ء میں مشرف نے میڈیا کو آزاد کیا اور پیمرا نے پرائیوٹ FM ریڈیو اسٹیشن کھولنے کے لیے بڑے بولی دہندگان کو لائسنس بیچے۔ اس کے نتیجے میں 40 سے زائد ایف ایم سٹیشن وجود میں آئے جن کی نشریات لاکھوں پاکستانیوں خواہ وہ دیہی علاقے کے تھے یا شہری ان تک پہنچیں۔ شروع کے چند سال جب ریڈیو لائسنس آزاد کیے گئے، یہ خاصے سستے تھے نجیب احمد، ریڈیو پاور 99 کے بانی اور سربراہ نے ایف ریڈیو کا لائسنس تقریباً تین ملین روپے میں حاصل کیا۔

آج کل FM ریڈیوز میں مقابلے اور زیادہ مقبولیت نے لائسنس کی قیمت کو تقریباً تیس ملین روپے تک پہنچا دیا ہے۔ اس اضافے کا مطلب ہے کہ نئے اسٹیشن، سرمایہ کاروں، بڑے میڈیا گروپوں، جاگیرداروں یا سیاستدانوں جو کہ اکثر اوقات اندونی طور پر ایک ہوتے ہیں ان کی ملکیت ہیں۔ شروع میں زیادہ تر میڈیا گروپوں کی توجہ ٹی وی لائسنس حاصل کرنے پر رہی مگر اب وہ ریڈیو میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

نئے ایف ایم ریڈیو کھولنے میں غیر پیشہ ورانہ لوگوں کی کمی بھی ایک رکاوٹ ہے۔ نجیب احمد کے مطابق صرف چند صحافیوں کو ریڈیو کی تربیت حاصل ہے۔ یونیورسٹیاں ریڈیو کی عملی مہارت کی تعلیم نہیں دیتیں اس لیے ریڈیو کو اپنے رپورٹروں کو تربیت دینا پڑتی ہے۔ ریڈیو رپورٹروں کی کمی کا مطلب ہے کہ اکثر ریڈیو اسٹیشن موسیقی اور کبھی گفتگو نشر کرتے رہتے ہیں۔ ریڈیو پاور 99 اور چند دیگر مٹھی بھر پرائیوٹ اسٹیشن بھی صرف خبریں نشر کرتے ہیں یا سیاسی اور معاشی موضوعات پر کچھ معلوماتی فیچر نشر کرتے ہیں۔

گورنمنٹ کا ملکیتی پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن (PBC) کا ادارہ ابھی تک پاکستان میں چھایا ہوا ہے اس کے زیادہ تر سامعین دیہی علاقوں میں بستے ہیں۔ PBC کے ریڈیو پاکستان اور ایف ایم 101 اپنے 31 سٹیشنوں کے ذریعے جو کہ 80% پاکستانی علاقے 96.5% آبادی اور 95.50 ملین سامعین کے ساتھ ہر لحاظ سے سرفہرست ہے۔[10]

نجیب احمد جنہوں نے ریڈیو سے تربیت حاصل کی اور ریڈیو پاکستان میں 14 سال کام کرتے رہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ریڈیو پاکستان پہلا حکومتی آلہ تھا جسے بنیادی طور پر پروپیگنڈہ کے لیے استعمال کیا گیا۔ آج کل اصلاحات کے عمل سے گزر رہا ہے مگر اصلاحات اس کے لیے بڑا چیلنج ہونگی کیونکہ 6000 کے قریب ملازمین اس سے وابستہ ہیں۔

10- پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن ویب سائیٹ http://www.radio.gov.pk/aboutus.thm

3.5 تعلیمی وتربیتی ادارے

صحافت کا پہلا شعبہ 1941ء میں پنجاب یونیورسٹی میں قائم ہوا۔اس کے بانی پروفیسر پی پی سنگھ نے صحافت میں ایم اے کی ڈگری میسوری یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ پروفیسر سنگھ کی سوچ اور خیالات نے پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں کی صحافت پر امریکی اثرات کی بنیاد رکھی اور یہ ابھی تک واضح طور پر باقی ہیں۔

کراچی یونیورسٹی میں 1955ء میں شعبہ صحافت قائم کیا گیا۔صحافیوں کے لیے ابتدائی ڈپلومہ کورس 1962ء میں متعارف ہوا جسے بعدازاں ماسٹرز پروگرام میں ترقی دے دی گئی۔اس کے بعد دو دہائیوں تک یونیورسٹی سطح پر کوئی نیا صحافتی شعبہ قائم نہیں کیا گیا۔

1970ء کی دہائی میں پورے ملک اور گومل یونیورسٹی، ڈیرہ اسماعیل خان یونیورسٹی، شعبہ ابلاغ عامہ سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد میں چار مزید شعبے قائم ہوئے۔شعبہ صحافت و ابلاغ عامہ پشاور یونیورسٹی اور شعبہ ابلاغ عامہ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان نے بالترتیب 1985ء اور 1987ء میں شام کے اوقات میں ڈپلومہ کورسز شروع کرائے۔

1988ء میں پشاور میں اور بعدازاں 1991ء میں ملتان میں پورا ماسٹرز ڈگری پروگرام شروع کیا گیا۔دیگر دو شعبے جو 1980ء کی دہائی میں شروع کیے گئے وہ علامہ اقبال یونیورسٹی کا شعبہ ابلاغ عامہ (1986ء) اور بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ کا شعبہ ابلاغ عامہ (1987ء) ہیں۔علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی بھی فاصلاتی تعلیم کا کورس کراتی ہے جبکہ دوسرے شعبے روایتی طریقے سے تعلیم دیتے ہیں۔شعبہ ابلاغ عامہ ہزارہ یونیورسٹی (NWFP) اور نمل یونیورسٹی اسلام آباد میں قائم کیے گئے۔ صحافتی نصاب کے ساتھ بہترین پانچ یونیورسٹیاں پشاور، لاہور، ڈی آئی خان، کراچی اور BZU ہیں۔[11]

ایک بہت بڑی تعداد میں پرائیوٹ ادارے صحافتی کورس کرواتے ہیں مگر ان کا معیار یونیورسٹی میں پڑھائے جانے والے کورس سے خاصا کم ہے۔

3.6 پاکستان میں صحافت اور صحافتی کارکنان

پاکستانی صحافیوں کے کام کی نوعیت ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ان کا انحصار میڈیا کی قسم پر ہے کہ آیا وہ الیکٹرانک میڈیا ہے یا پرنٹ میڈیا۔اس کے پڑھنے یا سننے والے دیہی علاقوں کے ہیں یا شہری۔ان کی زبان انگریزی ہے یا اردو اور میڈیا کا سائز کیا ہے۔وہ مقامی ہے یا قومی۔

پیسے کی تقسیم کی بنیاد پر بھی ایک طرف پرنٹ میڈیا کے صحافی اور دوسری طرف ٹی وی کے صحافی اور دیگر الیکٹرانک میڈیا کے کارکنان ہیں۔

اخباری صحافیوں کی آمدنی کم ہوتی ہے۔اکثر کوئی واضح کنٹریکٹ نہیں ہوتے اور تنخواہیں بھی بروقت نہیں ملتیں۔سرکاری اخبار میں کم از کم تنخواہ 10,000 روپے (120 یورو) مقرر ہے۔بڑے اخبارات میں عموماً ایک ملازم 15 سے 20 ہزار روپے ماہانہ کماتا ہے۔بڑے قومی اخبارات اور خصوصاً انگریزی اخبارات کے ملازمین کی تنخواہیں زیادہ ہیں۔

PFUJ کے جنرل سیکرٹری مظہر عباس کے مطابق 80% سے زائد اشاعتی اداروں کے صحافیوں کے پاس معاہدے یا ملازمت کا ثبوت نہیں ہوتا۔میڈیا مالکان زیادہ تنخواہ سے بچنے کے لیے بہانے تراشتے رہتے ہیں۔عباس کے مطابق ڈان نے اخبار میں تنخواہوں کی شکایت سے بچنے کے لیے صحافیوں کے ساتھ ایک سب کنٹریکٹر کے ذریعے معاہدہ کر رکھا ہے۔

خصوصاً ایک دیہی اخبار کے لیے کام کرنا بہت مشکل ہے۔عباس کہتا ہے کہ بعض اوقات دیہی اخبار کے مالک کے ہاں کوئی تنخواہ نہیں ملتی اور اشتہارات بیچ کر پیسے کا لالچ دیا جاتا ہے۔

11- یہ تفاصیل شعبہ ماس کمیونیکیشن اور جرنلزم کے پروفیسر الطاف اللہ خان نے فراہم کیں۔

بہت سے دیہی علاقوں کے صحافی مقامی اخبارات کے لیے جز وقتی یا بغیر معاہدہ کے کام کرتے ہیں اور بڑے شہری یا قومی میڈیا کو مقامی خبریں فراہم کرتے ہیں۔ مالی حالات کے ساتھ ساتھ ان صحافیوں کو اپنی حفاظت سے متعلق اور قانونی معاملات اور انشورنس میں کسی قسم کی مدد یا حمایت حاصل نہیں ہوتی۔

صحافتی تربیت بھی مختلف ہے۔ کچھ مقامی صحافیوں کو کوئی تعلیم یا تربیت میسر نہیں ہوتی۔ بہت سے افراد کم آمدنی والے شعبوں سے آتے ہیں جیسے سکول ٹیچرز، وہ صحافی جو انگریزی بول اور لکھ سکتے ہیں ان کے لیے بہتر آمدنی متوقع ہوتی ہے۔ اگر آپ پرنٹ میڈیا کے صحافی ہیں تو آپ کے لیے شہری اشرافیہ کے معیار کے میڈیا میں ملازمت بہتر تصور کی جاتی ہے۔

شہری میڈیا کے پاس بے شمار کالم نگار ہوتے ہیں جو مختلف شعبوں سے آئے ہوتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کالم نگار ریٹائرڈ فوجی افسران، علماء، ماہرین تعلیم اور دانشور ہوتے ہیں جو عموماً مالی لحاظ سے آسودہ حال ہوتے ہیں اور معاشرے کے اونچے طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر بہت اثر ورسوخ والے ہوتے ہیں اور بہت سی خبروں کی رپورٹنگ کے لیے اندرونی معلومات فراہم کرتے ہیں۔

پاکستانی خواتین صحافیوں کا اپنا الگ دائرہ کار ہے۔ عموماً خواتین صحافیوں کو سیاست یا شورش زدہ علاقوں کی کوریج تفویض نہیں کی جاتی لیکن وہ اپنے آپ کو معاشرتی اور ثقافتی رپورٹنگ تک ہی محدود رکھتی ہیں۔ زیادہ تر خواتین رپورٹرز بڑے شہروں اور ملکی میڈیا کے لیے یا خصوصاً الیکٹرانک میڈیا میں کام کرتی ہیں۔

4 موجودہ تنازعات کی روشنی میں میڈیا کی مشکلات

پاکستانی صحافیوں اور میڈیا کے کارکنوں کا تحفظ

پاکستان میں صحافی، مدیران، کیمرہ مین، میڈیا کے دیگر کارکنوں اور مالکان کے مسلسل قتل، جسمانی اذیتوں اور دباؤ کے واقعات سے خاصی تشویش پائی جاتی ہے۔ تشدد اور دھمکیوں نے سنجیدہ مسائل کو جنم دیا ہے جس سے میڈیا کی مکمل کوریج کے لیے موضوعات اور زمین سکڑ کر رہ گئی ہے۔

2009ء کے حالیہ اعداد و شمار کے مطابق صحافیوں کے قتل کے حوالے سے پاکستان دنیا میں پہلے نمبر پر رہا آج تک چھ صحافیوں کو قتل کیا جا چکا ہے جبکہ مئی 2009ء سے ایک صحافی دھمکیاں ملنے کے بعد سے غائب ہے۔ بڑھتے ہوئے تشدد کی یہ صورت حال فوجی حکومت کے آخری دنوں کی یادیں تازہ کرتی ہے۔ مئی 2007ء سے لے کر مئی 2008ء تک 15 صحافیوں کا قتل ہوا تھا۔ 357 کو گرفتار کیا گیا 123 کو جسمانی تشدد کے ذریعے زخمی کیا گیا اور 154 صحافیوں کو خوف و ہراس کا نشانہ بنایا گیا۔ 18 واقعات میں میڈیا کے دفاتر پر حملے اور توڑ پھوڑ کے واقعات ہوئے جبکہ 88 کی تعداد میں حکومت کی جانب سے زبان بندی کے حکم جاری ہوئے۔[12] 2008ء میں 12 صحافی قتل ہوئے جبکہ 41 واقعات میں 74 صحافیوں کو چھوٹے بڑے جسمانی زخم آئے۔[13]

4.1 پاکستانی میڈیا کے لیے حفاظتی مشکلات

علاقائی جھگڑے

حالیہ اعداد و شمار کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ گزشتہ چند برسوں سے پاکستانی صحافیوں کی جانیں مشکلات سے دوچار رہی ہیں موجودہ تنازعات کے تناظر میں فاٹا اور صوبہ سرحد کے جنوب مغربی علاقے صحافیوں کے لیے خاصے خطرناک ثابت ہوئے ہیں نسبتاً کم شورش زدہ بلوچستان کا علاقہ بھی بعض اوقات مسائل کا باعث بنتا رہا ہے کیونکہ گزشتہ سالوں سے ان خطوں میں خاصی بدامنی دیکھنے میں آئی ہے جس کی وجہ سے صحافیوں اور عموماً کیمرہ مینوں کی زندگی کو خطرات لاحق رہے۔ مختلف علاقوں میں حفاظت اور سیکورٹی کے پیمانے بھی مختلف ہیں جن کا انحصار وہاں کے جغرافیائی حالات اور مختلف قوتوں پر ہے۔

وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقے (فاٹا)

اسلام آباد کی وفاقی حکومت سرکاری طور پر قبائلی علاقوں کے نظم و نسق کی ذمہ دار ہے لیکن فاٹا مکمل طور پر کبھی بھی کسی مرکزی حکومت کے قابو میں نہیں رہا۔ برطانوی نوآبادیاتی دور سے فاٹا کے پشتون حق خود اختیاری کے تحت جو کہ قومی سیاست میں قربانیوں کے اثرات کے عوض حاصل ہوئی، زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سفاکانہ نگرانی کا آئینہ دار یہ نظام فرنٹیئر کرائم ریگولیشن (Frontier Crime Regulation) کہلاتا ہے۔ فاٹا کا رقبہ 27,000 مربع کلومیٹر اور آبادی 3.50 ملین نفوس پر مشتمل ہے۔ 50 فی صد قومی شرح خواندگی کے مقابلے میں ان کا تناسب 17 فی صد ہے۔ جب کہ خواتین کی خواندگی کی شرح محض 3 فی صد ہے جو کہ خواندہ خواتین کی قومی اوسط 36 فی صد کے مقابلے میں پائی جاتی ہے۔ تقریباً 66 فی صد خاندان غربت کی شرح سے نچلے درجے پر زندگی گزار رہے ہیں۔[14]

9/11 کے بعد انسدادِ دہشت گردی کی جنگ میں فاٹا مرکزی حیثیت اختیار کر گیا۔ باغیوں کے خلاف شروع کی گئی جنگ کی طرح 2002ء سے پاکستانی افواج بھی عسکریت پسندوں کے خلاف حالتِ جنگ میں ہیں لیکن وہ ابھی تک اپنی عمل داری منوانے میں ناکام دکھائی دیتی ہے۔ 2 سال سے زائد عرصے میں امریکہ ڈرون حملوں میں مصروف ہے فاٹا کا علاقہ القاعدہ اور پاکستانی طالبان کی دسترس میں ہے۔ افغانستان اور سمندر پار حملے کرنے کی غرض سے یہ علاقہ محفوظ جنت تصور ہوتا ہے۔

12- انٹرمیڈیا۔ اینویل اسٹیٹ آف پاکستان میڈیا رپورٹ، 08-2007

13- انٹرمیڈیا، رپورٹ 2008 http://intermedia.org.pk/Media%20in%20Pakistan%202008- pr.pdf

14- ڈینیل مارکی، سیکیورنگ پاکستانز ٹرائبل بیلٹ، کونسل فار فارن ریلیشن نمبر 36، اگست 2008، ص 5

فاٹا میں کام کرنے والے صحافیوں کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں ایک عام تخمینے کے مطابق یہ تعداد 200 کے لگ بھگ ہو سکتی ہے لیکن ماضی قریب میں بڑھتے ہوئے خطرات کے ڈر سے بہت سے صحافیوں نے رپورٹنگ کرنا ترک کر دی ہے۔ بہت سے صحافی جو ان علاقوں میں رپورٹنگ کرتے ہیں وہ لوگ آزاد پیشہ اور جز وقتی نامہ نگار ہیں اور میڈیا کی کسی بھی تنظیم سے تعلق نہیں رکھتے۔ یہ اسی دباؤ کا ردِعمل ہے کہ گذشتہ 2 تا 3 سالوں سے صحافیوں نے غیر ملکی میڈیا کے اداروں کے لیے کام انجام دینا بند کر دیا ہے۔ انتہا پسند گروہوں کا بین الاقوامی سطح پر مضبوط جال بچھا ہوا ہے اور جو بھی ان غیر ملکی ایجنسیوں کے لیے کام کرتا ہے فوراً پہچان لیا جاتا ہے۔ رپورٹنگ کا شعبہ خاصی مشکلات کا شکار ہے خصوصاً جب سے بمباری شروع ہوئی ہے حالات انتہائی ناگفتہ بہ ہیں۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹ (PFUJ) کے سیکرٹری جنرل جناب مظہر عباس کا کہنا ہے کہ صحافیوں کے خاندان خطرات کی زد میں رہتے ہیں اور انہیں علاقہ بدر ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

فاٹا میں کام کرنے والے صحافی اور میڈیا کے کارکن گزشتہ کئی سالوں سے اپنی حفاظت کے مسائل سے دوچار ہیں اور لگتا ہے کہ اب انہوں نے حالات سے سمجھوتہ کر ہی لیا ہے۔ فاٹا میں کام کرنے والے مقامی ریڈیو کے ایک ملازم نے بتایا کہ عسکریت پسندوں کے زیر کنٹرول علاقوں میں ان کی مسلط کردہ پالیسی کے تحت کام کرنا پڑتا ہے۔ ایسی حدود کا تعین کر دیا گیا ہے جس کے درمیان رہ کر پروگرام نشر ہوتے ہیں، فرقہ وارانہ مسائل، تحقیقی رپورٹیں اور فوجی آپریشن کی تفصیلی خبروں سے پہلوتہی برتنا پڑتی ہے۔ یہ بیانات ایسے ذرائع سے حاصل شدہ ہیں جنہوں نے اپنے نام مخفی رکھنے کی ہدایت کی ہے۔

چنانچہ دھمکیوں اور متشدد کارروائیوں سے بچنے کے لیے میڈیا کی کوشش ہوتی ہے کہ فوج، طالبان اور عسکریت پسندوں کے درمیان خبروں کا توازن قائم رکھا جائے۔ تمام بڑی پارٹیاں جو اس تنازعے کا اہم کردار ہیں صحافیوں کو ہی ڈراتی دھمکاتی رہی ہیں عسکریت پسند گروپ اور حکومتی خفیہ ایجنسیاں صحافیوں کے قتل اور ان کے ساتھ روا رکھی جانے والے بدسلوکی کے تانے بانے کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ حالیہ دنوں میں عسکریت پسندوں کے روابط تعطل کا شکار رہے ہیں۔ جس سے سنجیدہ مسائل نے سر اٹھایا ہے۔ روزنامہ ''نوائے وقت'' اسلام آباد کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر جاوید صدیق کے بقول اب طالبان یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ رپورٹر اور نمائندے پاکستان آرمی کے لیے کام کرتے ہیں۔ حالانکہ پہلے پہل میڈیا کے نمائندوں کے عسکریت پسندوں سے کام کے حوالے سے افہام وتفہیم پائی جاتی تھی اور یہی وجہ ہے عسکریت پسندوں کے انٹرویوز لینے میں کامیابی ہوئی لیکن آج کل صحافی حضرات جارحانہ رویوں کا شکار ہیں اور انہیں مخالف ایجنٹ سمجھا جا رہا ہے اور دوسری جانب بمباری نے بھی شدید مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔

مظہر عباس کہتے ہیں کہ ''شدید بمباری کی وجہ سے رپورٹنگ خاصی دشوار ہو گئی ہے۔ صحافیوں کے اہلِ خانہ مسلسل خطرات کی زد میں رہتے ہیں اور انہیں کسی بھی نئے مقام پر جانے کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے۔

اس نازک صورت حال نے فاٹا میں معلومات کا بڑھتا ہوا خلا پیدا کر دیا ہے۔ آبادی بیرونی دنیا کی خبروں سے بے بہرہ رہتی ہے۔ فاٹا کے متعلق خبریں صرف شہ سرخیوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ صراحت کے ساتھ بیان کی ہوئی رپورٹنگ بھی تحقیقی صحافت سے عاری ہوتی ہے۔

شمالی مغربی سرحدی صوبہ (NWFP)

صوبہ سرحد کا وسیع رقبہ گزشتہ کئی سالوں سے افواج اور عسکریت پسندوں کے درمیان تنازعات کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ خصوصاً جنوبی اور مغربی سرحدی اضلاع تو میدانِ جنگ بنے ہوئے ہیں۔ فاٹا کے شورش زدہ علاقوں میں صحافیوں نے رپورٹنگ کے معاملے میں مختلف پارٹیوں کی مخالفت مول لینے سے بچنے کے لیے اپنے اوپر خود ساختہ پابندیاں اور سنسر شپ عائد کر رکھی ہے۔ صوبے کے متاثرہ حصوں میں تحقیقاتی یا جامع رپورٹنگ کا فقدان ہے۔ 2009ء میں صوبہ سرحد میں خودکش حملوں کی منظر کشی کرتے ہوئے دو صحافی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

گزشتہ ڈیڑھ سال سے بدامنی میں اضافہ ہی دیکھنے میں آیا ہے اور اس کی شدت بڑھتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شورش

زدہ علاقے اپنا حلقہ اثر وسیع کرتے جا رہے ہیں اور مقامی صحافی نئے علاقوں کی جنگی چالوں سے ناواقفیت کی بنا پر حفاظتی اور سیکورٹی کے مسائل سے دوچار ہیں۔ ضلع سوات جو کہ شریعہ کے قانون اور پاکستانی طالبان کے کنٹرول میں رہا صحافیوں کو یہاں نئے حقائق اور صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔

صوبہ سرحد اور سوات کے متعلق تین سال تک خبروں کی رپورٹنگ کرنے والے اخبار کے ایک صحافی کا کہنا ہے ''شروع شروع میں میڈیا کے لوگ حفاظتی اقدامات کے متعلق اتنے فکر مند نہیں تھے اور نہ ہی بلٹ پروف جیکٹیں زیب تن کرتے تھے لیکن آج خیالات وسیع ہو چکے ہیں اور کچھ لوگ حفاظتی جیکٹس بھی استعمال کرنے لگے ہیں تاہم آج بھی کچھ ٹیلی وژن چینلز یہی غلطی دہرا رہے ہیں اور اپنے صحافیوں کی حفاظت کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔

ایک رپورٹر جس نے اپنے نام کو خفیہ رکھا کا کہنا تھا کہ ''خاص طور پر سوات کے جنوبی حصے کے عسکریت پسند سفاکانہ رویے کے حامل ہیں اور صورتِ حال قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہے کوئی بھی کسی وقت حملہ کر سکتا ہے اگر آپ شورش زدہ علاقے میں ہیں تو کسی وقت بھی فائرنگ کے تبادلے کی زد میں آ سکتے ہیں۔''

سینئر صحافی اور ''نیوز'' کے پشاور میں ایڈیٹر جناب رحیم اللہ یوسف زئی نے بھی بگڑتی ہوئی صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے اس خطے میں پچھلی تین دہائیاں کام کیا ہے۔ 1990ء کی دہائی میں دو مرتبہ اسامہ بن لادن کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ وہ سیکورٹی کے حوالے سے خطرناک صورتِ حال کا مقابلہ کرنا بھی جانتے ہیں۔

انھوں نے وضاحت کی کہ ''موجودہ نازک صورت حال کی وجہ سے حالات خطرناک شکل اختیار کر چکے ہیں اب رپورٹنگ کرتے وقت آرمی، خفیہ ایجنسیوں، عسکریت پسندوں اور قبائلی گروہوں کے مفادات کا خیال رکھنا پڑے گا۔ آپ جو کچھ بھی ریڈیو پر وضاحت کرتے ہیں اس کو تمام گروپوں کی جانب سے نہایت سنجیدگی اور قریب سے دیکھا جاتا ہے۔''

اس تنازعے کے تمام کردار عوامی تعلقات (PR) کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ ہیں یوں لگتا ہے کہ عسکریت پسند یہ سمجھتے ہیں کہ میڈیا نے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکا کر ان کی ساکھ کو مجروح کیا ہے اس طرح وہ لوگ خبروں کی ترسیل کو کنٹرول کرنے کے لیے خاصے بے چین رہے ہیں۔

''عسکریت پسندوں کے خوف کی وجہ سے لوگ میڈیا سے بات کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں ایسے میں سیل فون ہی ایسا ہتھیار رہ جاتا ہے جو صحافیوں کی پہنچ کا ذریعہ ہے۔ آپ کو کیمرے سے تمام گرمی بھی سہنی پڑتی ہے اور کیمرہ مینوں کی حفاظت اور سیکورٹی کے تقاضے نبھانے کے لیے انہیں ہوٹل سے دور بھی رہنا ہے اور زیادہ مقامات خطرناک اور دور افتادہ ہیں۔'' یہ ایک صحافی کے خیالات تھے جو سوات کے علاقے میں خدمات انجام دے رہا ہے۔ یقیناً مذکورہ احتیاطی تدابیر کو نظر انداز کرنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔

'جیو' ٹیلی وژن کے رپورٹر موسیٰ خان کا واقعہ اس ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے جسے سوات میں نامعلوم افراد نے قتل کر دیا تھا اور یہ واردات پاکستان میں طالبان کی سرگرمیوں کی کوریج کے دوران پیش آئی۔ پاکستان کے صفِ اول کے صحافی حامد میر کا کہنا ہے کہ ''موسیٰ کو نہ صرف قتل کیا گیا بلکہ اس کا سر بھی قلم کر دیا گیا تھا اسے سوات میں رپورٹنگ کے دوران مسلسل دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ یوں ہنستا بستا گھر ایک دم افسردگی میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔'' ''ڈان'' کی رپورٹ کے مطابق موسیٰ کو مقامی طالبان کی جانب سے ماضی میں بھی دھمکیاں مل چکی تھیں۔

بلوچستان

بلوچستان کے تنازعے کا پس منظر یکسر مختلف ہے۔ بلوچستان کی تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے تو ان کی آزادی اور جدوجہد کی تحریکیں صوبے کے ذاتی وسائل پر بلوچوں کے مالکانہ حقوق اور وفاقی حکومت کے ناجائز دباؤ کا نتیجہ نظر آتی ہیں۔ اسلام آباد کی جانب سے وسائل سے مالا مال صوبے میں سیاسی اور اقتصادی خودمختیاری کی راہ میں رکاوٹوں نے اس پسماندہ صوبے کے بلوچ رہنماؤں اور قوم پرستوں کو آگے آنے کے لیے جواز فراہم کیا ہے پاکستانی افواج نے بلوچوں کو طاقت کے زور سے کچلنے

اور ''تقسیم کرواور حکومت کرو'' کی پالیسی سے دبانے کی کوشش کی لیکن اس دباؤ سے پشتون اسلامی جماعتوں اور دیوبندی بنیاد پرستی کے عوامل کو تقویت ملی اور سیکولر اور اعتدال پسند پشتون قوتوں کے خلاف رائے عامہ ہموار ہوئی۔[15]

اسلامی عسکریت پسندوں کے ساتھ ساتھ عسکری اور کٹر بلوچ علیحدگی پسندوں کی جانب سے مقامی میڈیا کے افراد کو دھمکیاں، بدسلوکی اور اغوا جیسے مسائل کا سامنا رہا ہے۔ 2008ء میں 2 صحافیوں کا قتل ہوا جبکہ 5 کو اغوا اور 12 صحافیوں کے ساتھ تشدد آمیز سلوک کیا گیا۔ میڈیا سے بدسلوکی کے حوالے سے سرکار بھی کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ دسمبر 2008ء میں اردو روز نامہ ''انتخاب'' کے بیورو چیف بہرام بلوچ پر گواد رکی رپورٹنگ کے دوران حملہ کیا گیا۔ فروری 2008ء میں عبدالصمد چشتی مجاہد جو کہ اردو کے ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' کے لیے کام کر رہے تھے کو نامعلوم افراد نے کوئٹہ میں گولی ماردی (کوئٹہ افغان سرحد کے قریب واقع ہے) ایک علیحدگی پسند تنظیم بلوچستان لبریشن آرمی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔

بلوچستان میں عمومی طور پر میڈیا مراکز پر حکومت بمقابلہ نسلی گروہ کے تنازعاتی تصادم میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹ کے جنرل سیکرٹری مظہر عباس کے کہنے کے مطابق علیحدگی پسند اکثر اخبارات پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ حکومت کے حق میں کام کر رہے ہیں اور وہ صحافیوں کو حکومتی ایجنٹ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

صوبے کے شمالی پشتون حصوں اور کوئٹہ کے اردگرد رہائش پذیر افغان طالبان اور عسکریت پسند گروہوں نے میڈیا کے تحفظ کو مزید خراب کیا ہے۔

بڑے شہر اور دیگر علاقے

یوں تو بلوچستان، فاٹا اور صوبہ سرحد میں صورتِ حال انتہائی خطرناک شکل اختیار کر چکی ہے مگر گزشتہ چند سالوں سے پنجاب، سندھ اور وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں بھی قتل، اغوا اور تشدد کی کارروائیاں دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ صرف 2008ء میں 12 میں سے 3 قتل، 74 میں سے 27 متشدد کارروائیاں تو صرف پنجاب میں وقوع پذیر ہوئی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عسکریت پسندوں اور حکومتی سیکورٹی کے اداروں کے درمیان تنازعات محض فاٹا اور صوبہ سرحد تک محدود نہیں رہے۔ پنجاب سب سے زیادہ گنجان آباد صوبہ ہے اور اس کی آبادی 80 ملین نفوس پر مشتمل ہے اور یہی وجہ ہے کہ سب سے زیادہ میڈیا کی نمائندگی بھی یہیں سے ہے۔ مزید براں پنجاب میں لاہور، سندھ میں کراچی اور اسلام آباد انتخابی سرگرمیاں ہوں یا وکلا کی سیاسی تحریک ان شہروں کی حیثیت مرکزی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ بم حملوں اور دیگر کارروائیوں میں ملوث لشکر طیبہ (LeT) کی طرح دیگر کئی عسکری تنظیموں کی بنیاد پنجاب میں ہی رکھی گئی۔ سیکورٹی کے اس بگڑتے ہوئے ماحول کی وجہ سے ہی لاہور اور اسلام آباد جیسے شہروں میں میڈیا کے مفادات متاثر ہوئے ہیں۔ 2009ء میں اسلام آباد اور راولپنڈی میں 2 صحافیوں کا قتل ہوا۔ لاہور میں ایک صحافی قتل ہوا اور دوسرا اغوا کیا گیا کراچی میں حکومتی جماعت PPP اور MQM کے درمیان سیاسی تنازعات کی صورت میں صحافیوں میں خوف و ہراس پھیلایا گیا۔

جزا اور سزا کے پس پردہ محرک

صحافیوں کے قتل، تشدد اور دباؤ کی کارروائیوں کے پیچھے عسکری، انٹیلی جنس ایجنسیاں، مذہبی اور سیکولر عسکریت پسند، سیاسی عمائدین اور جرائم پیشہ تنظیموں کا ہاتھ رہا ہے۔ فوجی حکومت کے زوال اور جمہوری قوتوں کے اقتدار میں آنے کے بعد میڈیا کے کارکنوں کو ڈرانے دھمکانے کے واقعات کی ذمہ داری عسکری اور انتہا پسند تنظیموں نے اپنے سر لے لی ہے۔ خصوصاً میڈیا نے 2007ء کے لال مسجد کے واقع کے بعد عسکریت پسندوں کے حوالے سے جو سخت رویہ اپنایا اس سے حالات تبدیل ہوئے جس میں انتہا پسندوں کا امیج خراب ہوا اور ان کی فوج کے ساتھ مزاحمت کو پریس میں بھی اچھالا گیا۔

اور گہرائی میں دیکھا جائے تو یہ کہنا انتہائی مشکل ہوگا کہ صحافیوں پر حملوں میں ملوث افراد کے پیچھے اصلی چہرے کون ہیں۔ تشدد اور قتل کی وارداتوں کی درست سمت میں تحقیق نہیں کی جاتی اور بمشکل ہی کوئی مقدمہ حل ہونے کی نوبت آتی ہے۔ ان

15- پاکستان بھولا بسرا تنازعہ بلوچستان، انٹرنیشنل کرائسسز گروپ، 2007ء

حقائق کی روشنی میں صحافیوں پر بلا جواز حملے جاری ہیں اور ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔

صحافیوں کی حفاظت کا فقدان

صحافی بھی شاذ و نادر ہی کبھی احتیاطی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ فاٹا اور صوبہ سرحد میں سینئر صحافیوں اور مقامی میڈیا کے کارکنوں نے خطرناک صورتِ حال میں آگے بڑھنے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ وہ شورش زدہ علاقوں میں مختلف گروہوں کے درمیان جنگی واقعات کو اپنے تجربات کی روشنی میں حسنِ توازن سے پیش کرتے ہیں۔ ''نیوز'' پشاور کے ایڈیٹر رحیم اللہ یوسف زئی کی طرح منجھے ہوئے صحافی اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ مخصوص واقعات کی من وعن اشاعت کتنی خطرناک ہوتی ہے اور اس طرح کے حالات سے صحافیوں کا کنی کترا کر گزر جانا ہی بہتر ہے۔

ان علاقوں کے کچھ صحافیوں نے میڈیا کی مدد کرنے والی انٹرنیوز (Internews) یا PFUJ جیسی تنظیموں سے حفاظتی تربیت حاصل کی ہے لیکن رحمت اللہ یوسف زئی کا کہنا ہے کہ چند ہی ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے واقعی تربیت سے استفادہ کیا ہے۔

''یہ ایک اقتصادی سوال ہے غیر ملکی صحافی پوری طرح تربیت یافتہ اور مسلح ہوتے ہیں جبکہ مقامی صحافی مناسب سیکورٹی سے عاری ہوتے ہیں اور زیادہ تر کے پاس تو بلٹ پروف جیکٹ کی مانند حفاظتی مصنوعات کی کمی پائی جاتی ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کیمرہ انشورش شدہ ہوتا ہے جبکہ کیمرہ مین کی انشورنش کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔'' یہ دلچسپ ریمارکس جناب یوسف زئی کے تھے۔

PFUJ کے مظہر عباس کا کہنا ہے کہ پاکستان میں نہایت ہی قلیل پیمانے پر میڈیا کے حفاظتی تربیتی پروگرام منعقد ہوتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں متنازعہ علاقوں سے وابستہ مسائل سے نمٹنے کے لیے صحافیوں کی تربیت کا کوئی پروگرام موجود نہیں اور نہ ہی حفاظتی اقدامات کسی کورس کا حصہ ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ بموں کا پھٹنا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ دو صحافی محض اس لیے ہلاک ہوئے کہ وہ بم دھماکے کے واقعے کی کوریج کے لیے موقع واردات پر پہنچے۔[16] اور اسی وقت دوسرا بم زوردار دھماکے سے پھٹ گیا اسی طرح براہِ راست فائرنگ کے تبادلے سے بچاؤ کے لیے اگر صحافیوں کی تربیت کی جاتی تو جسمانی نقصان سے بچا جا سکتا تھا۔

ریڈیو 99 جیسا نشریاتی ادارہ اپنے پروگراموں میں انتہا پسندوں اور عسکریت پسندوں کے خلاف سخت موقف کا حامی ہے مگر سیکورٹی کے اقدامات اس کے ایجنڈے میں بھی شامل نہیں حالانکہ ریڈیو اسٹیشن مسلسل دھمکیوں کی زد میں رہتا ہے لیکن اس ادارے کے مالک اور ایڈیٹر اس بات پر یقین ہی نہیں رکھتے کہ وہ اپنے اور ملازمین کے تحفظ کی خاطر کوئی خاص قدم اٹھائیں۔

دراصل مسئلہ یہ ہے کہ صحافی اپنے تحفظ کے لیے ممکنہ حفاظتی اقدامات میں بہتری کے متعلق ادراک ہی نہیں رکھتے جیسا کہ شورش زدہ علاقوں میں کام کرنے والے ''ڈان'' کے ماہر اور تجربہ کار صحافی عرفان اشرف کے بقول ''صحافی حضرات صحافتی تدابیر سے بے بہرہ ہیں انہیں اپنی حفاظت کا مطلق احساس نہیں صوبہ سرحد اور فاٹا میں کام کرنے والے صحافی اس قدر پڑھے لکھے نہیں ہیں یہ لوگ بنیادی طور پر کاروبار اور درس وتدریس کے شعبوں سے وابستہ تھے اور محض روزگار کی غرض سے حادثاتی طور پر صحافت میں آ گئے یہی وجہ ہے کہ وہ موجودہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے نئی حفاظتی تدابیر کے مطابق تربیت یافتہ نہیں۔''

وہ یقین سے کہتے ہیں کہ اسلام آباد اور لاہور کے میڈیا کے مراکز شورش زدہ علاقوں سے کافی دور واقع ہیں لیکن صحافی حضرات انہیں انتہائی خطرناک علاقوں سے خبریں بھیجتے وقت خاصے دباؤ کا شکار رہتے ہیں۔ ڈان کے ایڈیٹر جناب ظفر عباس کی رائے میں میڈیا کے اداروں میں ایک دوسرے کے ساتھ مقابلے کے رجحان نے صحافیوں کی زندگی کو مشکلات سے دوچار کر دیا ہے۔

میڈیا کے مراکز کی بریکنگ نیوز کی دوڑ نے ایک ایسے مقابلے کی فضا قائم کر دی ہے جس میں حصہ لینے کے لیے صحافی

16- طاہر اعوان اور محمد عمران، 4 جنوری 2009ء کو صوبہ سرحد میں ڈیرہ اسماعیل خان کے پولی ٹیکنیک کالج کے دوسرے خودکش بم دھماکے میں جاں بحق ہوئے اور اس وقت وہ پہلے بم دھماکے کی رپورٹنگ کر رہے تھے۔

خطرات میں کود پڑتے ہیں۔صحافتی ادارے سیکورٹی اور حفاظتی حوالوں سے صحافیوں کی تربیت کے لیے نہایت کم توجہ دیتے ہیں۔PFUJ کے جناب مظہر عباس اس بات کی ضرورت پر زور دیتے ہیں کہ میڈیا کے اداروں کو تربیت کا اہتمام کرنا چاہیے اور وہ اپنے کارکنوں کی انشورنس کو بھی ممکن بنائیں۔''ابھی تک کسی بھی میڈیا کے ادارے نے اپنے ملازمین کی تربیت کے لیے کسی حفاظتی ورکشاپ کا انتظام نہیں کیا ہم نے اس مسئلے کو مالکان کی تنظیموں میں اٹھایا ہے کہ وہ لوگ معاشی طور پر اس قدر مستحکم ہیں کہ انہیں کورسز کا اجراء کرنا چاہیے۔'' انہوں نے وضاحت کی کہ میڈیا کے صرف 2 ادارے ایسے ہیں جنھوں نے اپنے ملازمین کی انشورنش پالیسی پر عمل درآمد شروع کر دیا ہے۔

ایک بڑے قومی اردو اخبار ''نوائے وقت'' کے مدیر جاوید صدیق اقرار کرتے ہیں کہ مذکورہ اخبار نے ابھی تک اپنے کارکنوں کی لائف انشورنش کی پالیسی تک نہیں بنائی لیکن جب کوئی واقعہ وقوع پذیر ہوتا ہے یا لوگ جان سے جاتے ہیں تو پھر اس مسئلے کو اجاگر کرنے کے لیے خوب اچھالا جاتا ہے۔''افراتفری کے موجودہ حالات میں تربیتی مقاصد کو نظر انداز کر دیا گیا ہے لیکن ہماری کوشش ہوگی کہ اس سلسلے میں بہتر اقدامات اٹھائے جائیں لیکن صد افسوس ہماری تنظیموں میں ماہرین کی کمی ہے'' نوائے وقت کے تقریباً 20 صحافی اس وقت قبائلی علاقوں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

اپنے ملازمین کے حفاظتی اقدامات کے حوالے سے ''ڈان'' کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔اخبار کے ادارے میں ایک خود ساختہ نظام موجود ہے جو ہر روز کی بجائے مخصوص مواقع کے لیے کام کرتا ہے۔کسی بھی عہدے دار کا بغیر احتیاطی تدابیر اختیار کیے متنازعہ علاقوں میں جانا ممنوع ہے۔بلٹ پروف جیکٹ، مرہم پٹی کا ضروری سامان، ابتدائی طبی امداد کی تعلیم بھی ضروری قرار دے دی گئی ہے۔ڈان نے پرخطر علاقوں میں کام کرنے والے صحافیوں کی انشورنش کا اجراء بھی کر دیا ہے۔ان تمام حقائق سے ڈان کے ایڈیٹر ان چیف عباس نے پردہ کشائی کی۔یکم اپریل 2009ء کو PFUJ نے "IFJ" کی مدد سے حکومت پاکستان اور میڈیا کے مالکان کو اکٹھا کر کے آگاہ کیا کہ ملک کے مسائل زدہ علاقوں اور قصبوں میں میڈیا کے ملازمین کس قدر خطرناک صورتِ حال سے دوچار ہیں۔"PFUJ" نے ان خدشات کا اظہار کیا کہ صحافی یا تو اس پیشے سے الگ ہو جائیں گے یا پھر مالکان اور ارباب اختیار کی بے حسی پر ماتم کرتے ہوئے صبر وضبط سے ثابت قدم رہیں گے۔

عباس کی رائے میں فاٹا میں ہونے والے تنازعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ خراب صورتِ حال کیا رخ اختیار کرنے والی ہے۔ماضی میں عسکریت پسندوں کا ایک غیر تحریر شدہ معاہدہ موجود ہوتا تھا جس کے تحت کسی کے اہل خانہ کو چھیڑا نہیں جاتا تھا لیکن اب تو انہیں بھی نہیں بخشا جاتا عدم برداشت کے رویے بڑھتے جا رہے ہیں۔صحافیوں کے گھروں کو جلا دیا جاتا ہے اور افراد خانہ کو قتل کر ڈالتے ہیں۔اب یہ علاقے جنگ زدہ تصور ہوتے ہیں۔جب کوئی علاقہ پہنچ سے دور ہو جائے تو پھر اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا کہ اسے خالی کر کے وہاں سے رپورٹنگ ترک کر دی جائے۔''

معلومات عامہ کی وزارت کے پرنسپل انفارمیشن آفیسر جناب شبیر انور کا کہنا ہے کہ صحافیوں کے لیے Victims Support Fund کا اجراء کر دیا گیا ہے اس فنڈ کو وجود میں آئے 4 سے 5 سال کا عرصہ بیت چکا ہے لیکن اسے قانونی حیثیت اب حاصل ہوئی ہے۔انور نے وضاحت کی کہ یہ امداد بھی اس صورت میں ملے گی جب پیسے فنڈ میں دستیاب ہونگے۔ آج تک صحافیوں کو دی جانے والی امداد کے سوال پر وہ رقم کا تخمینہ لگانے میں ناکام رہے اور نہ ہی انہیں اس فنڈ میں موجود پیسوں کا کوئی اندازہ تھا وہ یہ بتانے سے بھی گریز کر رہے تھے کہ اس فنڈ سے آج تک کتنے صحافیوں نے استفادہ کیا ہے۔

4.2 میڈیا میں بگاڑ

بیرونی عناصر کی مداخلت، پروپیگنڈے، رشوت ستانی، ناجائز دباؤ اور جبر واستبداد نے پاکستانی میڈیا کے رابطوں کو متاثر کیا ہے میڈیا پر اسلام کے کٹر پن نظریات کے اثرات پہلی مرتبہ اس وقت ظاہر ہوئے جب 1950ء کی دہائی میں پنجاب حکومت نے احمدیوں کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کیا نوائے وقت بھی ان اخبارات میں شامل تھا جنہیں پنجاب کی سرکار

احمدیوں کے خلاف عوام کے غیض وغضب کو ابھارنے کے لیے امداد فراہم کرتی رہی تھی۔ تب سے ہی انتہا پسند گروپ اور سیاسی پارٹیاں بشمول جماعت اسلامی، سپاہِ صحابہ اور حالیہ دنوں میں پاکستانی طالبان نے ذرائع ابلاغ میں اپنی جگہ مستحکم کر لی ہے۔ انہوں نے ذاتی میڈیا کو بھی فروغ دیا ہے اور اس کا جال وسیع کر چکے ہیں۔

انتہا پسند تنظیمیں اس قدر قوت پکڑ چکی ہیں کہ وہ کہیں بھی عدم استحکام پیدا کر سکتی ہیں یہی وجہ ہے کہ میڈیا بھی انہیں اپنے ایجنڈے کا حصہ بنانے پر مجبور ہے پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف پیس سٹڈیز کے سروے کے مطابق 16 صحافیوں اور ایڈیٹروں میں سے 69 فی صد کے خیال میں انتہا پسندی آزادیِ گفتار پر اثر انداز ہو رہی ہے اور 50 فی صد کی رائے میں انتہا پسند میڈیا مرکزی میڈیا پر اپنے اثرات ثبت کر رہا ہے جبکہ 57 فی صد کے مطابق میڈیا انتہا پسندی کے معاملات میں حقائق سے چشم پوشی برت رہا ہے۔[17]

جبر واستبداد مختلف شکلوں اور طریقوں سے میڈیا کو متاثر کرتا ہے ایک شخص نے اپنا نام مخفی رکھنے کی شرط پر بتایا کہ جب صحافی حضرات صوبہ سرحد کے شورش زدہ علاقوں میں مصروف عمل ہوتے ہیں تو عسکریت پسند ان کے پیچھے اس تاڑ میں رہتے ہیں کہ وہ عام لوگوں سے گفتگو نہ کر سکیں کیونکہ وہ ان کی آزادانہ روش کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

یہ تو نسبتاً کم جبر کی شکل تھی انتہا پسند تو صحافیوں ان کے خاندان والوں، میڈیا کے مالکان اور ایڈیٹر تک کو قتل کرنے سے نہیں چوکتے ''ڈان'' پشاور کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر وسیم احمد شاہ کا کہنا ہے کہ صحافی اور میڈیا کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے عوام تک متوازن معلومات اور اصل حقائق نہیں پہنچتے۔[18] اور یہ صورت حال ہر علاقے میں مختلف نوعیت کی ہے ملک کے جنوبی اور وسطی علاقوں میں انتہا پسندی کے اثرات اس قدر متاثر کن نہیں ہیں جس قدر حالات فاٹا اور صوبہ سرحد میں تباہ کن ہو چکے ہیں۔ میڈیا خود بھی انتہا پسندی کو اچھالتا ہے جب کچھ صحافی واقعات کی گرما گرم خبریں اور اس میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ 2007ء میں لال مسجد کے حادثے میں واقعات کو تفریحی رنگ میں پیش کرنے اور مسجد کے اندر محصور انتہا پسندوں کو ضرورت سے زائد وقت دینے پر میڈیا کو کڑی تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ صحافی تنقیدی حوالے سے تربیت یافتہ نہیں ہیں وہ معلومات اور تجزیوں سے کہانی کی اصل روح کے مطابق انصاف کرنے سے قاصر ہیں۔ انتہا پسند تنظیمیں میڈیا کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں تاکہ ان کے پیغامات کو دور دور تک پھیلایا جا سکے میڈیا اس حقیقت سے آگاہ ہے نتیجتاً صحافی انتہا پسندوں کو زیادہ کوریج دے کر اپنے آپ کو محفوظ بنا لیتے ہیں۔[19]

مضحکہ خیز معاملہ یہ ہے کہ صحافی، ٹیلی وژن کے نمائندے اور رپورٹر اپنے پروگراموں کو مقبول اور مشہور کرنے کے نقطۂ نظر سے رپورٹنگ کرتے ہیں اور یہ بڑے ٹیلی وژن اور چھوٹے اخبارات کی حد تک بھی ٹھیک ہے۔ اردو اخبارات انتہا پسند نظریات کو ہوا دیتے ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے قارئین اور ناظرین قدامت پرست ہیں اور وہ مذکورہ ایجنڈے کو پسند کرتے ہیں۔

صف اول کے میڈیا میں انتہا پسندی کے رجحان کے علاوہ خود ساختہ اسلام پسندوں کا اپنا علیحدہ میڈیا بھی وجود رکھتا ہے۔ پاکستان میں ہمیشہ سے اسلامی میڈیا موجود رہا ہے لیکن 1980ء کی دہائی سے تو ایک کٹر نظریاتی اسلامی میڈیا ابھرا جو افغانستان میں جہادی کارروائیوں اور اسلامی تحریکوں کے احیاء کے لیے کام کرتا رہا ہے۔ اب یہ میڈیا ایک متوازی صنعت کے طور پر بھی اپنے آپ کو منوا چکا ہے۔

انتہا پسندانہ نظریات پر مشتمل مواد سینکڑوں کی تعداد میں شائع ہو رہا ہے۔ 6 بڑی جہادی تنظیمیں 50 سے زائد اخبارات اور رسائل چھاپتی ہیں اردو ماہنامہ ''الدعوہ'' کی تقریباً ایک لاکھ کے قریب کاپیاں بازار میں آتی ہیں۔ کالعدم جماعت لشکرِ طیبہ کی ذیلی تنظیم ''جماعت دعوہ'' اس ماہنامے کو شائع کرتی ہے۔ لشکرِ طیبہ ہفت روزہ ''غزوہ'' بھی نکالتی ہے اور دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس کے 2 لاکھ کے قریب خریدار ہیں۔[20] اس کے علاوہ جماعت اسلامی 22 کی تعداد میں اشاعتیں نکالتی ہے جن کا موازنہ کسی بھی صفِ اول کے پاکستانی اخبار سے بآسانی کیا جا سکتا ہے۔

17- محمد اعظم، ریڈیکل لائیزیشن اینڈ میڈیا، Conflict & Piece Studies، جلد اول، 2008ء، PIPS، ص 32

18- ایضاً، ص 26

19- ایضاً، ص 25

20- جہادی پرنٹ میڈیا ان پاکستان، ایک جائزہ محمد عامر رانا، Conflict & Peace Studies، جلد 1، 2008، PIPS

یہ شمارے تمام ملک میں کسی بھی اسٹینڈ پر مل سکتے ہیں جن رسائل کی اشاعتوں پر پابندی عائد ہے وہ عبادت گاہوں کے اطراف میں تقسیم کیے جاتے ہیں یا خریداروں کو ان کے گھروں کے پتے پر ارسال کر دیے جاتے ہیں یہ اشاعتیں مجاہدین کے کارناموں اور امریکہ اور اسکے اتحادیوں کو بدنام کرنے والے مواد سے بھری ہوتی ہیں۔حکومتِ پاکستان پر نکتہ چینی کی جاتی ہے اور اسلام کی خاطر قربانی دینے والے اہل ایمان کی حوصلہ افزاء خبریں ہوتی ہیں۔عسکریت پسندوں کی کارروائیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کر کے تمام امہ کو اسلام کے دشمنوں کے خلاف متحد ہونے کی تلقین کی جاتی ہے۔ جہادی اور دوسری عسکری تنظیمیں اپنے مقاصد کے لیے الیکٹرانک میڈیا بھی استعمال کرتی ہیں۔ پشاور یونیورسٹی میں ماس کمیونیکیشن کے پروفیسر الطاف اللہ خان کا کہنا ہے کہ فاٹا اور صوبہ سرحد میں سینکڑوں زیرِ زمین ریڈیو اسٹیشن کام کر رہے ہیں۔

ریڈیو کو اپنے مقاصد کی خاطر پروپیگنڈے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس کا ایک اہم استعمال خوف و ہراس پھیلانا بھی ہے۔ طالبان نے ریڈیو کے ذریعے فاٹا اور صوبہ سرحد کے علاقوں میں رہنے والے لوگوں میں جو کہ باقی ملک سے کٹے ہوئے ہیں اور طالبان تنظیموں کے ساتھ مغویوں جیسی زندگی بسر کر رہے ہیں کے درمیان نفرت اور خوف کو بطور ایک مفید ہتھیار کے استعمال کیا ہے سوات میں مولوی فضل اللہ کی جانب سے قائم FM ریڈیو کے پیغامات میں حملوں کا خوف پھیلایا جاتا۔اس کے بعد ان لوگوں کے نام نشر کیے جاتے ہیں جنہوں نے ریڈیو پر اعلان کے باوجود عمل درآمد نہیں کیا ہوتا۔لوگ باقاعدگی سے ریڈیو کو سنتے ہیں کہ کہیں ان کا نام تو نہیں پکارا گیا یا ان کے کاروبار یا پیشے پر پابندی لگا دی گئی ہو۔لڑکے بالے ریڈیو اپنے پاس رکھتے ہیں تاکہ وہ یہ سن سکیں کہ ان کے اسکول میں منعقد ہونے والی تقریب کی اجازت ملی ہے کہ نہیں یا پھر لڑکیوں کے کھلے عام پھرنے کی عمر کی حد میں مزید کتنی کمی کر دی گئی ہے۔

پاکستان میں کئی ریڈیو اسٹیشن انتہا پسندوں کے ہتھے چڑھ چکے ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ PEMRA نے کمیونٹی یا غیر کمرشل FM ریڈیو کی نشریات کو لائسنس دینے سے مستثنیٰ قرار دے رکھا ہے۔PEMRA کے پاس یہ حق موجود ہے کہ وہ علاقائی ریڈیو کے لیے سپیشل لائسنس جاری کرے لیکن دیکھا گیا ہے کہ ایسا کرنے سے بھی کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔

فاٹا PEMRA کی حدود سے باہر ہے۔وفاقی حکومت قبائلی علاقوں میں لائسنس جاری کرنے کی مجاز ہے۔انفارمیشن کی وزارت کے پرنسپل انفارمیشن آفیسر یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ کمیونٹی ریڈیو کو آزاد بنیادوں پر چلانے کے لیے بھی فری فریکونسی کا نظام ہونا چاہیے۔

الطاف اللہ خان کی رائے کے مطابق سماجی تبدیلی،عوام کی صحت کے مسائل،تعلیم اور جمہوریت کا فروغ کمیونٹی ریڈیو کا ہی مرہون منت ہے اور کسی انتہا پسند تنظیم کا ریڈیو بند کرنا یا اس کی نشریات کو روکنا ممکن ہے لیکن اس کا متبادل مہیا کرنا یا معمول کی نشریات کا جاری رہنا زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

حکومت،فوج اور انٹیلی جنس ایجنسیاں،جبر و استبداد،پابندیوں اور ایڈورٹائزمنٹ بجٹ کے ذریعے میڈیا کے ایجنڈے کو متاثر کرتی ہیں۔انٹرنیشنل کرائسسز گروپ کی عہدیدار ثمینہ احمد کے بقول رشوت کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔''بلند پایہ صحافی بھی لین دین میں ملوث پائے گئے ہیں لیکن صحافیوں کی تنظیمیں یا یونین ان معاملات میں نہیں پڑتیں۔''

4.3 معلومات کا خلاء

پاکستان کے کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جہاں معلومات کا فقدان رہتا ہے یا وہاں ایسی خبریں پہنچتی ہیں جو یک طرفہ اور گھڑی ہوئی ہوتی ہیں۔

فاٹا اور صوبہ سرحد کے مخصوص علاقوں میں رہنے والے لوگ سالہا سال سے طالبان کے رحم و کرم پر زندگی بسر کر رہے ہیں اور یہ علاقے اہم اخبارات کی پہنچ سے بھی دور ہیں کیونکہ یہاں اشاعت شدہ مواد کی فروخت خطرے سے خالی نہیں۔محض گنے چنے افراد ہی ٹیلی وژن سیٹ خریدنے کی استطاعت رکھتے ہیں اور FM ریڈیوز کی وساطت سے انتہا پسند بھی نفرت انگیز

پروپیگنڈہ نشر کرتے رہتے ہیں جو معلومات کا اہم ذریعہ ہے۔

فاٹا کی خبر ایجنسی میں چار نشریاتی اداروں میں صرف ''خبر ریڈیو'' ہی خبروں کا واحد ذریعہ ہے۔ ''ریڈیو خیبر'' کے ایک ملازم نے بتایا کہ نیوز رپورٹس صرف مقامی واقعات کی معمولی تفصیلات پر مبنی ہوتی ہیں اس علاقے میں ''ریڈیو خیبر'' ہی پشتو زبان میں خبریں سنانے والا اکلوتا ذریعہ تصور ہوتا ہے۔''

سرکاری طور پر فاٹا کے لوگ حکومتی سرپرستی میں چلنے والے میڈیا پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔ سرکاری سرپرستی میں چلنے والے پانچ ریڈیو اسٹیشنوں کے علاوہ حکومت نے کسی FM ریڈیو کو نشریاتی لائسنس جاری نہیں کیا، مگر اس کے باوجود مذہبی انتہا پسند تنظیمیں 100 سے زائد غیر قانونی ریڈیوز کی نشریات چلا رہی ہیں زیادہ تر آبادی یہ تک نہیں جانتی کہ فاٹا سے باہر کیا ہو رہا ہے یا ملک سے باہر حالات کس نہج پر ہیں۔ تاہم کچھ ریڈیو اسٹیشن ایسے بھی ہیں جن کی بیرونی نشریات فاٹا میں بھی سنائی دیتی ہیں۔

ان میں اسلام کا ریڈیو 99 بھی شامل ہے جو صوبہ سرحد میں واقع احمد آباد کے FM ٹرانسمیٹر کی بدولت صوبے کے دور دراز علاقوں کے علاوہ سوات اور فاٹا کے کچھ حصوں میں جس کی نشریات سنائی دیتی ہیں اور لوگ بھی پروگرام کے دوران علاقائی صورتِ حال سے لحہ بالحہ آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ ریڈیو ایک ایسی مثال ہے جس نے پسماندہ علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو بھی فضائی لہروں کے ذریعے کم ترقی یافتہ پہنچ سے دور اور شورش زدہ علاقوں میں ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے اور جو دور افتادہ سرحدوں پر واقع لوگوں اور شہری سامعین کو اظہارِ رائے کے برابر مواقع فراہم کرتا ہے۔

موبائل فون بھی بیرونی دنیا سے لوگوں کے رابطوں کا بہترین ذریعہ ہیں لیکن یہ سہولت دیہات میں بسنے والے لوگوں میں مقبولیت حاصل نہیں کر سکی۔

صوبہ سرحد اور سوات بھی غیر قانونی ریڈیوز پر نشر ہونے والے پروپیگنڈے کے دباؤ کا شکار ہیں۔ مثلاً کئی علاقوں میں انتہا پسندوں کی ریڈیائی نشریات میں پولیو کے قطرے پلانے کی مہم کے خلاف بھی پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کے استعمال سے بانجھ پن کا خطرہ ہے جہاں تک تعلیم اور صحت کی معلومات کا تعلق ہے ان علاقوں میں وہ بھی مفقود ہیں۔

بلوچستان میں بھی خبروں کے حوالے سے حقیقی توازن اور رسائی کا فقدان پایا جاتا ہے لیکن یہاں وجوہات کی نوعیت مختلف ہے۔ بلوچستان کا رقبہ کل پاکستان کا 55 فی صد جب کہ اس کی آبادی کا تناسب کل آبادی کا صرف 5 فی صد ہے افراد کی زیادہ تعداد شہروں میں اور خصوصاً کوئٹہ میں آباد ہے لوگ دور دراز علاقوں میں بھی بستے ہیں جہاں بجلی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی تک رسائی بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس مسئلے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام آباد کی وفاقی حکومت معلومات کی ترسیل کو قابو میں رکھتی ہے اور کچھ حد تک بلوچ آبادی کو بھی اندھیرے میں رکھنا مقصود رہا ہے اس پالیسی کا ایک اہم مقصد بلوچ علیحدگی پسند تحریک سے نمٹنا بھی ہو سکتا ہے۔

''PEMRA کا ادارہ ریاست کے قریب رہ کر کام کرتا ہے تاریخی طور پر دیکھا گیا ہے کہ کچھ علاقوں میں لوگوں کو معلومات سے محروم رکھنا حکومتی پالیسی کا حصہ رہا ہے۔'' پشاور یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کے ماہر اورنگ زیب خان نے مزید بتایا کہ ''بلوچستان شروع سے ہی ایک ایسا خطہ تصور ہوتا آیا ہے جہاں حکومتی پالیسی کا نفاذ ضروری سمجھا گیا'' اورنگ زیب خان آج کل بلوچستان میں میڈیا کے اثرات کے حوالے سے کام کر رہے ہیں۔

یہاں 2 سے لے کر 3 نجی ریڈیو اسٹیشن ہیں جبکہ ان میں سے ایک کوئٹہ کے باہر سے پروگرام نشر کرتا ہے۔ بلوچستان کا رقبہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے اور غیر ترقی یافتہ ہے عوام کی معلومات تک رسائی اپنے ذاتی ذرائع سے ہی ممکن ہے جو بی بی سی اور وائس آف امریکہ کی صورت میں ہے۔ شہری علاقوں میں کیبل ٹیلی وژن بھی دستیاب ہے لیکن افغان سرحد کے ساتھ ملحقہ علاقوں میں کیبل یا ریڈیو تک بھی رسائی موجود نہیں۔ اورنگ زیب خان کے بقول جوں جوں کوئٹہ سے فاصلہ بڑھتا ہے میڈیا کے پاؤں اکھڑتے چلے جاتے ہیں۔

خان اس بات پر زور دیتا ہے کہ موجودہ صورت حال میں بہتری لانے کے لیے پرنٹ میڈیا کو آگے لانا ہوگا کیونکہ ریڈیو

کا لائسنس حاصل کرنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ غیر سرکاری ریڈیوز کا پھیلاؤ بھی حکومتی مفاد میں نہیں خاص طور پر شمالی پشتون علاقے انتظامیہ کے خلاف ہیں اور اس لیے ان کے لیے لائسنس کا حصول مشکل تر ہو چکا ہے۔

پاکستانی خواتین، خصوصاً جو دیہی علاقوں میں رہائش پذیر ہیں یا جو زیادہ فرسودہ ماحول میں پروان چڑھتی ہیں، معلومات یا انفارمیشن کے بہاؤ سے یکسر محروم رہتی ہیں۔ ''عکس'' کی خواتین اور میڈیا کے شعبہ برائے ریسرچ کے پبلی کیشن سنٹر میں موجود تسنیم احمر کا کہنا تھا کہ خواتین جہالت کی وجہ سے پرنٹ میڈیا سے استفادہ کرنے سے یکسر قاصر ہوتی ہیں اس لیے انہیں شوہر بھی اندھیرے میں رکھتے ہیں اور موجودہ صورتِ حال کو تبدیل کرنے کے لیے سماجی اور اقتصادی تبدیلی کے ساتھ ساتھ خواتین میں ان کے حقوق کے حوالے سے بھی شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔

4.4 صحافتی استعدادِ کار

میڈیا اور صحافیوں کی قابلیت

پاکستان میں کئی منجھے ہوئے پیشہ ور صحافی ہیں جو ہر قسم کی صورتِ حال میں نہایت عمدہ طریقے سے صحافتی تقاضوں پر پورا اترتے ہیں لیکن ان کی مہارت کا معیار، تربیت یافتہ پڑھے لکھے اور پیشہ ور صحافیوں کی نسبت جاہل، غیر تربیت یافتہ اور مہارت سے عاری لوگ ہیں۔ بسا اوقات انتہائی ماہر صحافی بھی ایسی صورتِ حال میں کام کرتے ہیں کہ ان کے لیے صحافتی معیار کو برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

پاکستان میں الیکٹرانک میڈیا کے بڑھتے ہوئے حالیہ سیلاب نے متعدد صحافیوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ سرکاری ٹیلی وژن کے چند تجربہ کار صحافیوں نے بھی اپنی ملازمت سے الگ ہو کر نئے ٹی وی چینلز میں جگہ بنالی ہے لیکن اس میں سے زیادہ افراد کا تعلق پرنٹ میڈیا چھوڑ کر آنے والوں سے ہے۔ ٹی وی چینلز نوجوان صحافیوں کو دلکش مراعات اور نادر مواقعوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے اچھی تنخواہیں اور دلفریب مقامات پر کام کی پیش کش کرتے ہیں۔

ٹی وی چینلز میں اضافوں کے باوجود مناسب تربیت اور متعلقہ پیشہ وارانہ تعلیم کو ایک ساتھ نہیں چلایا گیا بڑے ٹیلی وژن چینلز اور ان کے رپورٹروں کو اس لیے تنقید کا نشانہ بننا پڑا کہ وہ سنسنی خیزیت پھیلانے اور بریکنگ نیوز کی جستجو میں رہتے ہیں۔ وہ جائے واردات پر لحہ بہ لحہ کی روداد کی خبریں تو دیتے ہیں مگر یہ تجزیاتی اور معلوماتی پس منظر سے عاری ہوتی ہیں اور اس کا پیش آنے والے واقعے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جیو ٹی وی کے سینیئر اسائنمنٹ ایڈیٹر فرخ تنویر ملک کا کہنا ہے کہ ''محدودِ چند افراد ایسے ہیں جو پیشہ وارانہ صحافت کی روح کو سمجھتے ہیں اور خبروں کے علم سے باخبر ہوتے ہیں۔ عموماً لوگ جو کچھ دیکھتے ہیں من وعن رپورٹ کر دیتے ہیں۔''

بریکنگ نیوز کے حوالے سے فرخ تنویر ملک نے وضاحت کی کہ مالکان کے دباؤ کی وجہ سے اس رویے نے فروغ پایا ہے۔ ''کہانی کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بیان کر کے غیر ضروری تفصیل میں الجھانا مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً چیف جسٹس اپنے گھر سے برآمد ہوئے ہیں اب کار میں سوار ہو گئے ہیں اور اب... یہ بریکنگ نیوز نہیں ہوتی مگر ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔''

سیاسی مذاکروں میں سنسنی پھیلانا بھی اعزاز سمجھا جاتا ہے کارکردگی کے حوالے سے اپنی رائے کے اظہار کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین میں ان کی مقبولیت کا باعث بن سکے یہی وجہ ہے کہ ٹیلی وژن شوز میں معتدل مزاج لوگ الگ تھلگ ہو کر خاموش تماشائی کا کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں۔

''آج'' ٹی وی اسلام آباد کے بیورو چیف خالد جمیل کے مطابق ٹی وی چینلز پر 5 یا 6 معتدل مزاج حضرات ایسے ہیں جو قومی مباحثوں پر چھائے رہتے ہیں۔ آرمی کے ریٹائرڈ آفیسرز اور پیشہ ور ماہرین سے انٹرویوز کے دوران بعض اوقات اناؤنسرز غیر ذمہ دارانہ رویوں سے بے بنیاد قیاس آرائیوں پر مبنی سازشوں پر بحث شروع کر کے تلخی پیدا کر دیتے ہیں۔

شاید کسی حد تک سنسنی خیزی کا یہ جواز ہوسکتا ہے کہ یہ نوزائیدہ میڈیا کی آزاد خیالی کا ثمر ہے یا پھر جاہ طلب صحافی، طاقت اور میڈیا کے ساتھ ذمہ داریاں نبھانے کے معاملے میں ابھی طفلِ مکتب ہیں۔ جیو نیوز کے فرخ تنویر کی رائے میں محض چند افراد ہی خبروں کے علم کو مکمل طور پر سمجھتے ہیں اور وہی ان سے انصاف بھی کرتے ہیں انہوں نے مزید تربیتی پروگرام شروع کرنے کی تجویز دی۔ عمومی طور پر ٹی وی کے صحافی تین ذرائع سے آئے ہیں۔ سابقہ پرنٹ میڈیا سے تعلق رکھنے والے صحافی اس خیال سے ٹیلی وژن کی رپورٹنگ کے شعبے میں آئے کہ یہاں زیادہ تنخواہیں، بہتر حالاتِ کار اور مناسب عہدے میسر تھے اس کے علاوہ نوجوان اور نووارد لوگ تھے جنہوں نے اپنے مستقبل کا آغاز ہی ٹی وی سے کیا تیسرا گروہ ان منجھے ہوئے ٹیلی وژن کے رپورٹروں یا اخبارات کے سینئر صحافیوں پر مشتمل ہے جو عموماً ایڈیٹوریل لکھتے ہیں اور انتظامی عہدوں یا پروگراموں کے روح رواں ہوتے ہیں۔

الیکٹرانک اور پرنٹ دونوں میڈیا سے تعلق رکھنے والے رپورٹرز، اینکرز اور ایڈیٹر بھی بے بنیاد قیاس آرائیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ ٹیلی وژن کے سیاسی مباحثوں میں اکثر ایسے تجزیہ نگار اور ریٹائرڈ آرمی افسران شامل ہوتے ہیں جو یک طرفہ سوچ کے حامل ہوتے ہیں اور اپنے ایجنڈے پر تنقید کے متحمل نہیں ہوتے اور پرنٹ میڈیا بھی کچھ ایسے ہی ماحول کی پیداوار ہے اور وہ بھی کبھی ایسی خبریں چھاپ دیتے ہیں جو غلط، جھوٹی، حقائق سے دور اور گھڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ ایسا معاملہ اکثر اشاعت محدود، سطحی اور بعض اوقات گمراہ کن انداز میں پیش کی جاتی ہیں۔ اخبارات اور ٹیلی وژن کی رپورٹوں اور مباحثوں میں یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ اکثر ان کے پیچھے کاروباری مفادات، پوشیدہ سیاسی ایجنڈے اور میڈیا پر دباؤ کی سوچ شامل ہوتی ہے۔ لیکن ابھی تک صحافی برادری، مقاصد کے حصول اور متوازن صحافت کی خاطر میڈیا کے طاقت ور مالکان کے خلاف متحد ہو کر آواز بلند نہیں کرتے۔ تعلیم و تربیت کو میڈیا کے بجٹ کا حصہ نہیں بنایا جاتا۔ ''جیو'' ٹیلی وژن کے فرخ تنویر ملک کہتے ہیں ''کچھ صحافی ملازمت کے دوران درمیانی مدت کے یا ریفریشر کورسز کر لیتے ہیں مگر وہ اپنی بھرپور کوشش کے باوجود بھی مطلوبہ سطح تک نہیں پہنچ پاتے۔''

تربیتی ثقافت کا فروغ

''ڈان'' کے ایڈیٹر ظفر عباس کے خیال کے مطابق پاکستانی صحافیوں کی تربیت ایک بڑے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے فی الوقتی لاپرواہی اور مگن رہنے کی سوچ ہر جگہ نظر آتی ہے محض چند صحافی اور میڈیا کے مراکز ہی تربیتی حوالے سے فنڈ مختص کرنے کے قائل ہوتے ہیں یہ مسئلہ بھی موجود ہے کہ تعلیم اور پیشہ وارانہ مہارت بڑھانے کے لیے سرمایہ لگانے کی حوصلہ افزائی ہی نہیں کی جاتی۔'' اس صنعت کے اصل کرداروں کو ابھی تک تربیت کی اہمیت کا احساس ہی نہیں ہوا اور اسے مسلسل نظر انداز کیا جاتا ہے لیکن انہیں یہ جتلانا پڑے گا کہ فی زمانہ تربیت کس قدر ضروری ہے اور جب کوئی حادثہ پیش آ جائے تو تب ان کا احساس جاگتا ہے۔ ڈان میں صحافیوں کی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تربیت نہیں کی گئی۔ کاش وہ تربیت یافتہ ہوتے تو شاید ماضی میں پیش آنے والے چند بڑے حادثات کی نوعیت مختلف ہوتی۔ عموماً صحافیوں کو قلیل رقم مہیا کی جاتی ہے اس لیے وہ اپنی ملازمت جاری رکھتے ہیں لیکن اگر صحافی تربیت یافتہ ہوتے تو لاریب 50 فی صد حادثات سے بچا جا سکتا تھا شورش زدہ علاقوں میں کوریج کرنے والے صحافیوں کے لیے تربیت یافتہ ہونا انتہائی ضروری ہے۔

دراصل تربیتی ثقافت کے فقدان میں ایک تو اقتصادی صورتِ حال کا ہاتھ ہے، دوسری جانب میڈیا کے مالکان کا ادراک اور فہم و فراست بھی مزاحم ہے۔ ان کے موجودہ رویے تربیت کے لیے سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے بلکہ وہ تجربے کو اس کا نعم البدل قرار دیتے ہیں۔

99 ریڈیو اسٹیشن کے نجیب احمد کے بقول تربیت کو میڈیا والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ''صحافیوں میں پیشہ وارانہ صلاحیت اور ہنر کی کمی ہے کسی یونیورسٹی میں عملی مہارت کا درس نہیں دیا جاتا یہی وجہ ہے کہ میں اپنے رپورٹرز کی خود تربیت کرتا ہوں۔'' انہوں نے اپنے چند صحافیوں کی برلن (جرمنی) ''ڈچ ولا'' سے اپنے زیرِ نگرانی تربیت کا بندوبست کیا وہ اس بات

پر یقین رکھتے ہیں کہ اس محاذ پر ہنگامی بنیادوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے ایک تو اس سے خارجی معاملات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور دوسرا پیشہ وارانہ صلاحیت میں اضافہ ہوگا۔

اس مسئلے کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ پاکستان کی یونیورسٹیوں میں صحافیوں کی تعلیم میں عملی اور فنی مہارت یا فیلڈ ورک پر نہایت کم توجہ دی جاتی ہے۔ پشاور یونیورسٹی کے شعبہ صحافت میں ماسٹر ڈگری کا نصاب کا کچھ حصہ صحافتی تربیت، نظری معاملات، رپورٹنگ، کمیونیکیشن اور حالات حاضرہ کی تعلیم پر مشتمل ہوتا ہے اور تربیتی حوالے سے فیلڈ میں کوئی تجرباتی پروگرام ترتیب نہیں دیا جاتا یہی وجہ ہے کہ اس خطے میں صحافت کا معیار خاصا پست ہے اور طلباء میں فیلڈ کی عملی مہارت میں اضافے کی شرح بھی کم دکھائی دیتی ہے۔

الطاف اللہ خان جو کہ ملک کا ایک اہم صحافتی اور ماس کیمونیکیشن کا ادارہ چلا رہے ہیں کا کہنا ہے ''ہم جس ماحول میں کام کر رہے ہیں اس میں عملی تجربے کی اشد ضرورت ہے گو کہ تعلیمی نظریات بھی اپنی جگہ نہایت اہم حیثیت کے حامل ہیں مگر ہمیں زبانی اور عملی استعداد کار میں توازن لانے کے لیے بین الاقوامی مدد بھی درکار ہے تاکہ ہم تربیتی معیار، صحافتی قانون سازی، میڈیا مینجمنٹ، شورش زدہ علاقوں میں میڈیا کا کردار اور تنازعات کے حساس معاملات کی رپورٹنگ کو سمجھ سکیں اور یہ مدد دانشوروں، اساتذہ، انسانی وسائل (HR)، ماہرین کی تربیت، مہارت بڑھانے کے تحقیقی مواد کی صورت میں ہوسکتی ہے۔

دوسری جانب علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ماس کیمونیکیشن کے شعبے کے ماہر ڈاکٹر سید عبدالسراج کا کہنا ہے کہ ان کی یونیورسٹی غریب لوگوں کی یونیورسٹی کہلاتی ہے اور اس کے BA کے فاصلاتی پروگرام میں ہر سال 24000 طلبا داخلہ لیتے ہیں۔ عمومی طور پر کورس پڑھائی کی کتابوں پر ہی مشتمل ہوتا ہے جبکہ تربیت کے لیے اردو زبان استعمال کی جاتی ہے۔ صحافیوں اور میڈیا کے پیشہ ور ماہرین کی موجودگی میں ملک کے 35 مراکز میں 10 روزہ ورکشاپس بھی منعقد کی جاتی ہیں۔

MA کے پروگرام میں 500 طلباء شامل ہوتے ہیں اور یہ انگریزی زبان میں پڑھایا جاتا ہے یہ ڈیپارٹمنٹ الیکٹرانک میڈیا میں M.Phil، Ph.D اور پوسٹ گریجوایٹ کورسز بھی کراتا ہے اور دو مہینے کی مدت کے تربیتی پروگرام بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ اب ٹیلی وژن کے متعلق بھی نصاب شامل کرنے کی منصوبہ بندی کی جارہی ہے۔

یونیورسٹی کے پروگراموں کا معیار اکثر پست درجے کا ہوتا ہے جب سے یونیورسٹی نے الیکٹرانک میڈیا کے پروگراموں کا اجراء کیا ہے تو جوانوں نے صحافت میں مستقبل ڈھونڈنے کے لیے دھاوا بول دیا ہے۔ یونیورسٹیوں کا حلقہ بھی وسعت اختیار کر گیا ہے صرف اسلام آباد اور راولپنڈی کی یونیورسٹیوں میں ماس کمیونیکیشن کے 10 شعبے کام کر رہے ہیں۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد کے ڈاکٹر سراج کا کہنا ہے کہ ان کے طلباء کا تعلق نچلے متوسط طبقے پر غریب دیہاتی آبادی سے ہوتا ہے۔ گریجویشن کی سطح کے طلباء 1000 روپے فی سمسٹر جب کہ ماسٹر کے طلباء 3000 روپے فی سمسٹر فیس ادا کرتے ہیں۔ صحافتی تعلیم ایک بڑے کاروبار کا درجہ اختیار کر چکی ہے اور یہ شعبہ 50 ملین پاکستانی روپے سالانہ کے حساب سے کما رہا ہے۔

اخلاقی ضابطے اور خود اصلاحی رویے

پاکستانی میڈیا کی تنظیموں اور صحافتی برادری نے ''پریس کونسل'' کے نظریے کی مخالفت کی ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے صحافت میں حکومت کا عمل دخل ناقابل برداشت حد تک بڑھ جائے گا صحافیوں کی یونین نے سابقہ پریس کونسل کے مانیٹرنگ کے شعبے میں اپنا نمائندہ نہ بھیج کر اسے اصولاً غیر موثر بنا دیا ہے۔

اس کی بجائے انہوں نے ایک خود مختار، آزاد اور خود اصلاحی کے نظام کو ترجیح دی ہے۔ اس مد میں کئی اقدامات بھی اٹھائے گئے ہیں اور طریقہ کار کو ترتیب دینے اور شروع کرنے میں اس صنعت اور مرکزی کردار کے حامل لوگوں کی تنظیموں کے درمیان تعاون اور ہم آہنگی کا فقدان نظر آتا ہے مگر اب یہ ناگزیر ہو چکا ہے کہ متعلقہ تنظیمیں خود اصلاحی طریقہ کار کے تحت اکٹھی ہوں اور ایک متفقہ لائحہ عمل کے لیے مل کر کام کریں۔

پیمرا کے افسران کی رائے کے مطابق الیکٹرانک میڈیا سینٹر میں اس ادارے کے تحت سخت قانون سازی کا اجراء کیا گیا تھا۔لیکن اب اس میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے ریڈیو اور ٹی وی میں ٹیلی کمیونیکیشن پروسیجرز کے تحت عمل درآمد کو ممکن بنایا جارہا ہے۔لیکن اس ڈھانچے کو باقاعدہ شکل دینے کے لیے مذکورہ صنعت سے وابستہ مرکزی کرداروں سے بات چیت ضروری ہے۔ اس مرحلے میں سب سے اہم ضرورت کردار سازی یا Code of Conduct کا احیاء ہے۔پیمرا کے موجودہ کوڈ آف کنڈکٹ میں بنیادی جمہوری رویوں کی پاسداری کے لحاظ سے قوانین کا فقدان ہے۔اس میں نہ تو صنعتی حوالے سے مفادات کا ذکر ہے اور نہ ہی میڈیا کے ماہرین کے ساتھ کسی قسم کے رجوع کی کوئی وضاحت کی گئی ہے۔

تاہم موجودہ حکومت کی جانب سے جاری کیے گئے پیمرا کی قانونی شقوں میں نظرثانی کے حوالے سے لچک کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا ہے۔انفارمیشن کی سابقہ وزیر (جو اپریل 2009ء میں اپنے عہدے سے مستعفی ہوگئیں) نے میڈیا کے نشریاتی اداروں کے افسران کے ساتھ اجلاس کے موقع پر یہ اپیل کی تھی کہ وہ پیمرا کے لیے Code of Conduct کا مسودہ تیار کریں تاہم پیمرا کے ساتھ میٹنگ میں اس کی وضاحت کردی گئی تھی کہ ارباب اختیار اس مسودے کو من وعن تسلیم کریں گے اور کسی قسم کی قانونی رکاوٹ کا باعث نہیں بنیں گے۔

4.5 پاکستان اور افغانستان کے مابین سرحدی تعلقات اور خبریں

پاکستان اور افغانستان کے مابین سرحدی تعلقات اور خبریں اور 1990ء کی دہائی میں طالبان کے غلبے کو تاریخی تناظر میں دیکھیں تو دونوں ملکوں کے تعلقات ایک دوسرے سے پیوست نظر آتے ہیں۔پاکستانی افواج کی پالیسی میں بھی افغانستان میں عمل دخل کی حکمت عملی کا جواز فراہم کیا گیا ہے۔دراصل پاکستان کو افغانستان کی سیاست میں دخل اندازی کے لیے حالات کے مطابق مجبور ہونا پڑا جیسا کہ ماضی میں طالبان کو بیرونی امداد کا مسئلہ درپیش ہوا یا پھر کرزئی حکومت سے دشمنی مول لینے کی بجائے مفاہمت اپنانا پڑی۔

بعض دفعہ ایسے حالات بھی پیدا ہوئے کہ افغانستان نے پاکستانی سیاست میں مداخلت کی اور بلوچستان کے علیحدگی پسندوں کو مضبوط کرنے میں اس کا ہاتھ دیکھا گیا پاکستان یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ افغانستان نے ڈیورنڈ لائن کو سرکاری طور پر ابھی تک بین الاقوامی سرحد تسلیم نہیں کیا جس سے بالواسطہ طور پر سرحدی علاقوں کے پشتون قبائل میں قوم پرستی کے جذبات پیدا ہوئے ہیں۔سرحد کے دو اطراف کے بسنے والے پشتون بھی ڈیورنڈ لائن کو نہیں مانتے کیونکہ افغانستان کا سب سے بڑا نسلی گروہ پشتون آبادی کی صورت میں (40 فی صد) موجود ہے جس میں سے 25 ملین پشتون صرف پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بارڈر کی صورت حال نے پشتون قومیت پرستی پر علیحدگی کی تحریکوں کی صورت میں پاکستان کے لیے مسائل پیدا کیے ہیں۔

افغانستان اور صوبہ سرحد اور فاٹا کے پشتون عوام کے درمیان خاصے گہرے رشتے قائم ہیں انہیں جب بھی اپنے ملک میں خطرات درپیش ہوئے تو یہ لوگ بارڈر پار کرکے پڑوسی ملک میں چلے جاتے ہیں۔

پاکستان میں افغانیوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے عمومی طور پر پاکستانی میڈیا افغانستان میں امریکی اور ISAF کے دستوں کی موجودگی کو ہی خبروں کا مرکز بناتا رہا ہے وہ سیاسی تبدیلیوں اور عوامی مسائل سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔افغانستان کے انتہاپسندی کے اصل مسئلے کو بھی یکسر نظرانداز کردیا جاتا ہے اور رپورٹس کی تصدیق کے لیے شاذ ہی کبھی صحافیوں کو اپنے پڑوسی ملک افغانستان جانے کا اتفاق ہوا ہو۔پشاور سے نیوز کے ایڈیٹر ان چیف یوسف زئی کا کہنا ہے کہ ''کابل میں کوئی پاکستانی نمائندہ موجود نہیں میڈیا کے ادارے اپنا کوئی نمائندہ وہاں بھیجنے کو تیار ہی نہیں ہوتے اور بین الاقوامی نیوز ایجنسیوں کی خبروں پر ہی بھروسہ کرتے ہیں ادھر افغان میڈیا کا بھی یہی عالم ہے ان کا بھی پاکستان میں کوئی رپورٹر نہیں ہے اور وہ ان معدودے چند پاکستانی رپورٹرز پر ہی انحصار کرتے ہیں جو پشاور میں بطور معاون کام انجام دے رہے ہیں۔

تاہم پاکستان کی پشتون پٹی یعنی صوبہ سرحد اور فاٹا سے تعلق رکھنے والے مقامی صحافیوں کے افغانستان میں روسی دراندازی کے زمانے سے افغانستان کے صحافیوں سے تعلقات چلے آتے ہیں۔ یوسف زئی کے بقول پاک افغان صحافیوں کے نہایت محدود پیمانے پر روابط رہے ہیں۔ دونوں ممالک کے پشتون صحافیوں کے درمیان مشترکہ ورکشاپ اور تربیتی پروگرام کا انعقاد ہو چکا ہے۔ برٹش کونسل نے سرحد کے آر پار کے صحافیوں کے سیمینار منعقد کرانے میں مدد دی۔ فریڈرچ ایبرہارٹ سٹف ٹنگ (FES) نے ان صحافتی سرگرمیوں کو ترتیب دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ دونوں ممالک کے صحافیوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے اور قریب آنے کا موقع ملا اور اس سے روابط بھی استوار ہوئے یوں خاص طور پر نوجوان صحافیوں کو نئی زبانیں سیکھنے میں مہارت حاصل ہوتی ہے اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور اعتماد میں لینے کے مواقع ملتے ہیں۔''

کچھ معاملات میں پاک افغان صحافیوں نے ایک دوسرے کے میڈیا کے لیے کام شروع کر دیا ہے۔ لیکن یوسف زئی کی رائے میں اب بھی بہتر تربیت اور وفود کے تبادلوں کی اشد ضرورت موجود ہے۔

پنجاب، سندھ اور پنجاب کے زرخیز آبادی والے علاقوں سے تعلق رکھنے والے پاکستانی صحافیوں کے اپنے مدمقابل افغان صحافیوں سے تعلقات کی نوعیت خاصی کمزور رہی ہے ایسے صحافیوں کے متعلق بھی شواہد ملے ہیں جو صرف بڑے بڑے ٹیلی وژن اسٹیشنوں کے لیے ہی کام کرتے ہیں۔ FES کے ہینگ ایفنر کے مطابق پاکستانی میڈیا کے ہر اول دستے سے تعلق رکھنے والے غیر پشتون نمائندوں کو اپنے افغان ہم منصبوں سے رابطے اور تعلق استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ FES کی طرف سے وفود کے تبادلے کے نتیجے میں کابل جانے والے 12 سینئر پاکستانی صحافیوں نے بھی اس نظریے کی بھرپور حمایت کی۔ افغان صحافیوں اور پارلیمنٹ کے منتخب نمائندوں سے تبادلہ خیالات کے بعد انہوں نے ضرورت محسوس کہ اس نوعیت کے مزید پروگرام بنائے جائیں تاکہ دونوں اطراف کے عوام میں باہم اعتماد کی فضا پیدا ہو اور آپس کے تعلقات میں بھی اضافہ ہو۔

پاکستانی صحافیوں کے آنے کے بعد افغان صحافیوں کے جوابی دورے کی منصوبہ بندی کی گئی جو کہ ابھی تک التوا کا شکار ہے۔ فریڈرچ ایبرہارٹ سٹف ٹنگ (FES) کا اگلا قدم دونوں ممالک کے میڈیا سے تعلق رکھنے والے ارباب اختیار کے درمیان اداروں کے تعلقات کار کو مضبوط بنانے کے لیے اقدامات کا احیاء ہے۔

5 سفارشات وتجاویز

پاکستان اس وقت تاریخ کے اہم موڑ پر کھڑا ہے۔ سالہا سال کی فوجی حکمرانی کے بعد جمہوریت کو مضبوط کرنے کا موقع میسر آیا ہے۔ پچھلے ادوار کے برعکس اس دور میں نئی اور آزاد خیال صحافت نے جنم لیا ہے جو ایک مثبت اور اہم تبدیلی کی نوید ہے۔ فوجی حکمرانی کو ختم کرنے اور عدلیہ کے بحران کو حل کرانے کے بعد پاکستانی صحافیوں نے سول سوسائٹی کے ساتھ مل کر جمہوریت کو مضبوط بنانے کی کوششوں میں ایک ایسے عمل انگیز کا کردار ادا کیا ہے جس کی پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ میڈیا بلاشبہ پاکستانی مملکت اور شہریوں کے بہتر مستقبل کی پہچان بن کر اُبھرا ہے۔

موجودہ دور میں جبکہ حکومتی ادارے کمزور ہیں اور ان کو سیاسی انتشار اور شدت پسندوں کی کارروائیوں کا سامنا ہے اور ملکی معاشی صورتحال بھی مخدوش ہے ان کے مضمرات میڈیا پر بھی مرتب ہوئے ہیں اور صحافیوں کی جانوں کو خاصے خطرات لاحق ہیں۔ معاشی مشکلات اور وسائل کی کمی کے باوجود باغیانہ سرگرمیوں اور برسوں کے فوجی دور کے بعد جمہوری تقاضوں اور ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے میڈیا کی ضرورت اہمیت اختیار کر چکی ہے۔

انٹرنیشنل میڈیا سپورٹ (IMS) کی منصوبہ بندی کی پوری توجہ ان ضابطوں کی جانب ہے جو کہ صحافت میں جمہوری اصلاحات لانے میں شورش زدہ، غیر محفوظ خطوں میں ٹھہراؤ اور تحفظ لانے کے لیے مثبت کردار ادا کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

IMS اپنے اس تجزیے کی بنیاد پر پاکستانی میڈیا اور اسے درپیش چیلنجز پر پورا اترنے کے لیے اس انتشار زدہ ماحول میں چار شعبوں پر توجہ مرکوز کرنے میں مدد کی سفارش کرتا ہے۔

1- صحافیوں اور صحافتی کارکنان کے جان و مال کا تحفظ
2- پاک افغان صحافتی تعلقات
3- شورش زدہ علاقوں میں معلومات کا خلاء اور صحافتی رکاوٹیں
4- معیاری صحافت

مذکورہ تجاویز میں یہ چار چیزیں بنیادی طور پر میڈیا کی موجودہ ضروریات کو حل کرنے کی کوششوں کا حصہ ہیں جس سے پاکستان میں جاری ان تنازعات کو فاٹا، سرحد اور بلوچستان کی صورتحال پر توجہ مرکوز کر کے حل کیا جا سکتا ہے۔ IMS کی یہ سفارشات پاکستان میں کام کرنے کے طریقہ کار میں راہنمائی فراہم کریں گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ سفارشات پر براہِ راست کام کے لیے مقامی اور بین الاقوامی شراکت داروں کے ذریعہ سے عمل درآمد کیا جائے گا IMS کو یہ امید بھی ہے کہ یہ سفارشات ان دیگر اداروں کو جو پاکستان میں میڈیا اور صحافیوں کی مدد کر رہے ہیں، کے لیے قابل توجہ اور راہنما ثابت ہوگی۔

5.1 صحافیوں کی حفاظت اور تحفظ

پس منظر اور توجیہ

پچھلے چند سالوں میں صحافیوں کے حوالے سے پاکستان دنیا کا خطرناک ترین ملک بن چکا ہے۔ امن عامہ کی صورت حال فاٹا اور سرحد میں خاصی مخدوش ہے۔ گزشتہ سالوں میں میڈیا کی مددگار تنظیموں نے ان دو علاقوں میں کام کرنے والے صحافیوں کی حفاظت کے لیے متعدد سیفٹی اور سیکورٹی کورسز منعقد کروائے۔ بدقسمتی سے دیگر علاقوں میں جہاں صحافیوں کو نشانہ بنایا گیا صرف چند لوگوں نے ہی حفاظتی حوالے سے تربیت حاصل کر رکھی تھی۔

ماضی میں کافی حد تک یہ کورس بغیر کسی منصوبہ بندی کے وقتی ضروریات کے تحت منعقد ہوتے رہے اور ان میں میڈیا کے اداروں کی شرکت بھی برائے نام رہی۔ صحافتی ادارے یا ان کے مالکان عمومی طور پر اپنے ملازمین کے جان و مال کے تحفظ کو اپنی

ذمہ داری نہیں سمجھتے۔

خوف اور حکومتی دباؤ، طاقتور سیاسی افراد اور گروہ، فوج اور دوسرے سیکورٹی کے اداروں اور ایجنسیوں اور شدت پسندوں کے درمیان اپنی استعدادِ کار میں بہتری لانے اور مناسب طریقے سے نبرد آماز ہونے اور درست معلومات تک رسائی حاصل کرنے کے لیے صحافیوں کے تحفظات دور کرنے کے علاوہ ان کی حفاظت میں بہتری لانا ہوگی مکمل معلومات پر مبنی ملکی مباحث، تقاریر اور بات چیت کو متحرک رکھنے کے لیے ان معلومات کا تبادلہ نہایت اہم ہے اور جمہوری روایات کو مضبوط بنانے کے لیے بھی اس کی اشد ضرورت ہے۔

اگر پاکستان میں میڈیا نے موجودہ جنگی صورت حال کی غیر جانبدارانہ اور متوازن کوریج کرنی ہے تو صحافیوں اور صحافتی کارکنان کے جان و مال کا تحفظ بھی یقینی بنانا ہوگا۔ مملکت کے اداروں اور افواج کے خلاف پرتشدد عسکری کارروائیوں کے اثرات کا جائزہ لینے اور آبادی اور مملکت کو لاحق خطرات پر قابو پانے کے لیے قابل عمل منصوبہ بندی اور متاثرہ علاقوں سے معلومات کے حصول کے لیے عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ خطرات اور خوف کو برداشت کرنے کی میڈیا کی صلاحیت اور صحافت کو تحقیر سے دیکھنے یا اسے نظرانداز کرنے کی کوششوں کے خلاف ادراک بھی ضروری ہے تاکہ انتہا پسندی سے بہتر انداز میں نمٹا جاسکے۔

حکمت عملی

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ صحافیوں اور صحافتی کارکنان کو کچھ عرصہ تک خطرات درپیش رہیں گے یہی وجہ ہے کہ ان کی مکمل حفاظت کے تناظر میں درمیانی مدت کے جامع، قابل عمل اور مالی لحاظ سے بہتر طریقے اپنائے جائیں۔ ایک جامع حفاظتی نظام جو کہ بیک وقت قابلِ عمل اور فعال ہو قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ خصوصاً اس چار نکاتی پروگرام پر عمل درآمد کرایا جائے۔

- تنازعات کی نگرانی اور اس کا ریکارڈ مرتب کرنا۔
- خطرات سے آگاہی اور حفاظتی تدابیر کی تیاری کی صلاحیت پیدا کرنا۔
- خطرات سے نبٹنے کا نظام۔
- حمایت حاصل کرنے کی کوششیں۔

نگرانی

میڈیا سے متعلق تشدد اور خوف و ہراس پھیلانے کے دیگر عوامل کی قابل اعتبار اور مفصل نگرانی کا نظام ایک بنیادی ضرورت ہے۔ خاص طور پر بچاؤ اور حفاظت کے طریقہ کار کو اپنانے کے لیے مناسب اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے جامع اعداد و شمار اکٹھا کرنے کا عمل صحافیوں اور دیگر میڈیا ورکرز کے لیے عوام اور حکومت کی طرف سے درکار بڑھتی ہوئی حمائیت حاصل کرنے کی کوششوں کی وکالت کرتا ہے۔

فی الوقت صرف چند گنتی کی تنظیمیں پاکستان میں میڈیا سیفٹی کی نگرانی انجام دے رہی ہیں۔ کچھ تنظیمیں بامقصد اور درست نگرانی کرتی ہیں مگر وہ بھی سالانہ بنیادوں پر عمل درآمد کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب صورت حال خراب ہوتی ہے تو بروقت جائزہ لینے اور فوری ردعمل کے طور پر حفاظتی طریقوں کے ساتھ مسلسل نگرانی کی ضرورت پڑتی ہے مگر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسی صورت میں بروقت کارروائی کا فقدان ہی رہتا ہے۔

چند تجاویز درج ذیل ہیں:

1- حالیہ نگرانی کے نظام کو بہتر بنایا جائے جو کہ موجودہ کوششوں کے مفصل اور ٹھیک اندازے کی بنیاد پر ہو تبدیلی لانے کے ان اقدامات میں پوری توجہ اس امر پر دی جائے کہ زیادہ خطرناک علاقوں میں نگرانی کے عمل کو قابل اعتبار بنایا جائے جو مفصل ہو اور بروقت بھی۔ ایک مربوط نظام کے تحت ہر واقعہ کی الگ الگ، درست اور حقیقی نگرانی کا ریکارڈ ہونا چاہیے

جس کو ایک جگہ جمع کر کے اس کے رجحانات کا اندازہ لگایا جائے۔ حاصل شدہ نتائج اور دیگر ممالک جیسے افغانستان (جہاں پر تنازعات پاکستان جیسے ہیں) اور کولمبیا (جہاں پر جدید نگرانی کا نظام رائج ہو چکا ہے اور کامیابی سے جاری ہے) سے تعاون کر کے بھرپور استفادہ کیا جائے۔ انٹرمیڈیا جو کہ سالانہ بنیادوں پر رپورٹیں شائع کرتی ہے اور پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹ جو کہ ان واقعات کی فہرست مرتب کرتی ہے۔ یہ دو تنظیمیں صحافتی خطرات کا جائزہ لیتی ہیں ان دونوں یا کسی ایک تنظیم سے تعاون، نگرانی کی استطاعت کو بڑھانے میں یہ عمل واضح طور پر مددگار ہو سکتا ہے۔

2- اس بات کو یقینی بنانا کہ یہ نظام معلومات اور تجزیوں کو متنوع مقاصد کی غرض سے نشر و اشاعت کے معیار پر پورا اترنے کے قابل سمجھے اور ان صحافیوں اور صحافتی کارکنان کی بروقت مدد کی جائے جنہیں خطرات لاحق ہوں۔ درست منصوبہ بندی اور ردعمل کے نظام میں بہتری کے لیے درکار اور خطرات کے بارے میں مرتب شدہ تجزیات کی روشنی میں اس مواد کی فراہمی جو کہ میڈیا کے مالکان اور حکومتی اداروں کو صحافیوں کے تحفظ کے لیے مزید حفاظتی اقدامات کے بارے میں دلائل پیش کرے۔

تنازعات اور خطرات میں صحافتی استعداد کار کی ضرورت

صحافیوں اور صحافتی کارکنان میں اس بات کا شعور پیدا کرنا کہ خطرے کی صورت میں کیسے بچاؤ کے طریقے اختیار کیے جائیں۔ مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ اس مقصد کے لیے تربیت اور دیگر طریقے بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔ خطرات سے آگاہی کی تربیت، تنازعات کے بارے میں زود حس صحافت کی تربیت کے ساتھ ملا کر ہونی چاہیے اور یہ عمل صحافیوں کو بہت ہی محتاط اور غیر جانبدار رپورٹنگ کے ہتھیاروں سے مزین کرے اور نصاب صحافی کو بحیثیت ایک محتاط رپورٹر کے اپنی خواہشات سے بالاتر ہو کر دیکھنے کے قابل بنا کر کام کرنے کی صلاحیت میں اضافہ کرے گا، نتیجتاً متحارب گروہوں کی دھمکیوں یا حملے کے خطرات بھی کم ہو جائیں گے۔

اس کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز ہیں:

1- پاکستان میں ایسے عمل کی ترویج جس میں ملکی اور غیر ملکی تنظیمیں شامل ہو کر خطرات سے آگاہی اور صلاحیتوں کی ترویج سے متعلق معلومات اور تجربات آپس میں بانٹ سکیں اور آپس میں تعاون اور مشترکہ لائحہ عمل طے کر سکیں۔

2- وسط مدتی جامع اور تربیتی اور صلاحیتوں کی ترویج کے پروگرام کو مرتب کرنا جو کہ انتہائی متاثرہ حصوں کی ضرورتوں کو مدنظر رکھ سکے۔ تربیت دینے والوں کی سوچ کی تربیت اور ایسے دیگر طریقے جو کہ مقامی صلاحیتوں کے حامل ہوں اور دیرپا ہوں انہیں ترجیح دی جائے۔

3- مرتب شدہ طریقہ کار کے تحت خطرات سے آگاہی اور خطرات سے زود حس صحافت سے متعلق ہوں ان کی وضاحت کرنا۔

4- ایڈیٹروں اور میڈیا مالکان میں خطرات سے آگاہی کو بڑھانا اور ایسے طریقوں کو رائج کرنے میں ان کی مدد اور حوصلہ افزائی کرنا جو کہ سیفٹی اور سیکورٹی کے معاملات میں بہتر طریقہ کار اپنانے میں ان کی راہنمائی کریں اور ان حفاظتی تدابیر کو بطور ادارہ اپنا لیں تاکہ یہ روزمرہ کا معمول بن جائیں۔ اس کے علاوہ میڈیا کے اداروں کو چاہیے کہ وہ حفاظتی جیکٹس اور دوسرا حفاظتی سامان خریدیں تاکہ فیلڈ میں کام کرنے والوں کی حفاظت یقینی بنائی جا سکے۔

خطرات میں مدد کا نظام

خوف اور اچانک خطرے کی صورت میں فوری ردعمل کو قابل عمل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ایک نظام قائم کیا جائے جو کہ خطرے کی صورت میں صحافیوں اور صحافتی کارکنان کی مدد کر سکے یہ حفاظتی نظام ملک کے رقبے اور مختلف علاقوں کے مخصوص حالات کو مدنظر رکھ کر علاقائی بنیادوں پر بنایا جائے۔ جبکہ عوامی طور پر تمام ملک میں تعاون کو جاری رکھا جائے۔ موجودہ اداروں یا مربوط اداروں یا مختلف اداروں کے کنسورشیم کے درمیان بندھن قومی اقدامات کی روشنی میں قائم کیا جائے۔

اس نظام میں پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹ اور ساتھ ہی ساتھ مقامی صحافتی تنظیموں کو بھی شامل کیا جائے۔ مثلاً فاٹا کی ٹرائبیل یونین آف جرنلسٹ یا محتاط انداز سے منتخب کیے گئے مقامی میڈیا کمیونٹی کے بااثر ارکان کی شمولیت یقینی بنائی جائے۔

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل تجاویز ہیں:

1- علاقائی بنیاد پر فنڈ قائم کرنا تاکہ ان میڈیا ورکرز اور صحافیوں کو مالی مدد فراہم کی جا سکے جنہیں خطرے کے پیشِ نظر کچھ عرصے کے لیے کسی محفوظ مقام پر منتقل ہونا پڑے یا جن کو مدد کی ضرورت ہو۔ محفوظ جگہوں کا قیام بھی اس فنڈ کے فرائض میں شامل ہو۔ اس بندوبست کے حصہ کے طور پر ایک ''ہاٹ لائن'' نظام بھی قائم کیا جانا چاہیے۔ جہاں سے اچانک خطرات یا حملوں کی رپورٹنگ کی جا سکے اور مدد فراہم کرنے کے لیے مناسب اقدام کیے جا سکیں۔

وکالت اور حمایت

2006ء کی سیکورٹی کونسل کی قرارداد نمبر 1738 میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ عام شہری بشمول صحافی، میڈیا سے منسلک کارکنان اور دیگر لوگوں کے خلاف بین الاقوامی انسانی حقوق کی خلاف ورزی سے روکا جائے۔ مزید یہ قرارداد اس بات پر زور دیتی ہے کہ یہ حکومتی ذمہ داری ہے کہ بین الاقوامی قوانین کے تحت ان شقوں پر عملدرآمد کو یقینی بنائے تاکہ زیادتی کا سدِ باب ہو اور ان کے خلاف کارروائی کرے جو بین الاقوامی انسانی حقوق کے قوانین کی شدید خلاف ورزی کے مرتکب ہوں اور ان تمام جماعتوں پر زور دیتی ہے جو کہ جنگی صورت حال میں ملوث ہوں کہ وہ صحافیوں، صحافتی کارکنان اور دیگر عام شہریوں کی جو ان سے وابستہ ہوں کی پیشہ وارانہ آزادی کا احترام کریں۔''

یہ قرارداد اور ساتھ ہی ساتھ بین الاقوامی انسانی حقوق کے ڈیکلیریشن کے آرٹیکل 19 اور دیگر بین الاقوامی قوانین واضح طور پر حکومت کی ذمہ داری گردانتے ہیں کہ وہ یہ بات یقینی بنائے کہ میڈیا کارکنان محفوظ رہیں اور کسی مداخلت کے بغیر اپنا پیشہ وارانہ کام سرانجام دیتے رہیں۔ یہ اصلاحی ہتھیار بنیادی اہمیت کے حامل ہیں جن کے ذریعے پاکستانی صحافیوں اور میڈیا کارکنان کی حفاظتی کوششوں کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

علمی سفارشات

1- حکومتی اداروں بشمول وزارت اطلاعات، وزارتِ داخلہ، فوجی حکام، سیکورٹی حکام اور پولیس کے درمیان بات چیت کا آغاز کیا جائے تاکہ معاشرے میں صحافت اور صحافی کے کردار کے بارے میں آگاہی اور سمجھ بوجھ بڑھائی جا سکے۔

2- میڈیا کے حقوق کی عالمی تنظیموں کو پاکستان بلایا جائے، مقامی مالکان سے ملاقات کروائی جائے۔ یہ تنظیمیں صحافیوں کی حفاظت کے لیے سرکاری حکام اور دیگر متعلقین کو قائل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں اس پروگرام میں اس بات پر بھی توجہ مرکوز رکھی جائے کہ وزارت اطلاعات سے سیفٹی فنڈ کی رقم میں اضافہ کروایا جائے۔

5.2 پاک افغان صحافتی تعلقات

پس منظر اور وجوہات

پاکستان کے مغربی علاقوں میں پائی جانے والی بے چینی کو افغانستان میں موجود بے چینی سے الگ نہیں دیکھا جا سکتا۔ پاکستان کے سیکورٹی تحفظات اور متنازعہ سرحد کا معاملہ شر پسندی کے خلاف پاک افغان تعاون کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

پاکستان، افغانستان اور مذہبی بین الاقوامی قوانین اس خطرے سے اکیلے نمٹ سکتے ہیں، مشترکہ فورم کے ذریعے علاقے میں طویل مدتی اور پائیدار امن قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان متنازعہ اور غیر حل شدہ سیکورٹی معاملات پر توجہ دی جائے۔ اگر علاقے میں طویل مدتی امن اور سکون دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ ان سیاسی مسائل اور

سیکورٹی معاملات کو باہمی رضامندی کے کسی فورم کے ذریعے حل کرایا جائے۔

پاکستان اور افغانستان میں اس عمل کے لیے کوئی مناسب علاقائی پلیٹ فارم نہ ہونے کی وجہ سے مناسب میڈیا کوریج کا فقدان رہا ہے۔ ہمسایہ ملک سے ہونے والی رپورٹنگ عموماً غیر متوازن اور غلط اطلاعات پر مبنی ہوتی ہے۔ پاکستانی میڈیا اس بات کو نہیں سمجھ پاتا کہ طالبان کے ساتھ اختلافات کیسے افغان عوام کو متاثر کرتے ہیں اور عمومی طور پر پاکستان میں اس بات سے اتفاق نہیں کیا جاتا کہ کس طرح ان کی پالیسیاں افغانستان میں تشدد کو جنم دیتی ہیں۔

پاکستانی میڈیا کی طرف سے ایسی کوئی کوشش نظر نہیں آتی جس سے پاک افغان سیاسی جماعتوں کو قریبی تعاون قائم کرنے میں مدد ملے تاکہ وہ سرحد کے دونوں اطراف سے اختلافات کو حل کرنے کی کوشش کر سکیں۔

غیر پشتون پاکستانی میڈیا کے افغان میڈیا کے ساتھ تعلقات اور افغانستان میں شورش کے اثرات کی کوریج بالکل معمولی نوعیت کی ہیں اور صحافیوں کے درمیان مل بیٹھ کر تبادلۂ خیالات نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی ایک وجہ معاشی وسائل میں کمی بھی ہے۔ پاکستانی میڈیا کے ایک بڑے حصے کی ترجیحات میں یہ شامل ہی نہیں کہ وہ دوسرے ممالک میں اپنے نمائندے مقرر کرے۔ البتہ پشتون میڈیا کے سرحد کے آر پار تعلقات قائم ہیں اور انفرادی طور پر لسانی بنیادوں پر یہ صحافی اپنے افغان ہم عصروں سے رابطے میں رہتے ہیں۔

پاک افغان صحافیوں اور میڈیا مالکان کے مابین مضبوط تعلقات ہی علاقے میں شورش کی وجوہات جاننے اور دونوں ممالک کے باہمی مسائل اور اختلافات زیادہ متوازن طریقے سے حل کرنے کی راہ ہموار کر سکتے ہیں۔

اہم تجاویز

1- فریڈرچ ابرٹ سٹف ٹنگ کی وساطت سے پاکستان اور افغانستان میں اعتماد سازی اور تعلقات کار کو بڑھانے کے اقدامات میں میڈیا کے درمیان بات چیت کے عمل کو بڑھایا جا سکتا ہے۔

2- موجودہ پاک افغان میڈیا میں پشتون صحافیوں کے موثر اور وسیع بنیادوں پر تعلقات دونوں اطراف کے بڑے صحافتی اداروں (بشمول غیر پشتون میڈیا) کے درمیان وسیع رابطے کا کام دے سکتے ہیں۔

3- بات چیت کے عمل میں شرکت کے لیے میڈیا کی جن تنظیموں کو مدعو کیا جائے ان میں مقامی و علاقائی میڈیا جو سرحدی علاقوں میں کام کر رہا ہے کے ساتھ ملکی میڈیا کے سرکردہ لوگوں کو بھی جو کہ دونوں ممالک میں رائے عامہ یا فیصلہ سازی میں اپنا اثر و رسوخ رکھتے ہوں شامل کیا جائے۔

4- اس بات چیت کے عمل کو کوئی بیرونی تنظیم رہنمائی فراہم کرے جس کے ان اختلافات میں اپنے کوئی مقاصد پوشیدہ نہ ہوں اور اسے دونوں ممالک کے میڈیا میں نمایاں حیثیت کا حامل رابطہ کار سمجھا جائے۔

5- پاک افغان میڈیا میں رابطے کے لیے خصوصی طور پر تین منصوبوں پر کام ہونا چاہیے یعنی بات چیت کا فورم، ٹیم رپورٹنگ اور Twining۔

بات چیت کا فورم

اس زمرے میں دونوں ممالک کے درمیان بات چیت کے عمل کو خوش اسلوبی سے آگے بڑھانے کے لیے مندرجہ ذیل ضروری اقدام تجویز کیے جاتے ہیں:

1- میڈیا کے مواد کی نگرانی، ایڈیٹرز اور سینئر صحافیوں سے انٹرویوز کا انعقاد جو کہ پاک افغان میڈیا میں دونوں ممالک کے حالات و واقعات کی بھرپور معلومات رکھتے ہوں اور اسی طرح کالموں اور صحافتی پسند و ناپسند ترجیحات کے بارے میں بھی سمجھ بوجھ کے حامل ہوں۔

2- اس مانیٹرنگ کے نتائج اور انٹرویوز کو اس فورم پر جہاں دونوں اطراف کے سربرآوردہ میڈیا کے فیصلہ ساز اور سرکردہ لوگ علاقائی تعاون کو بڑھانے اور زیادہ متوازن بین السرحدی کوریج کے بارے میں بات چیت کے لیے اکٹھے

بٹھائے جائیں اس فورم کو معزز صحافیوں اور ایڈیٹرز کا صحافتی جرگہ بھی تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام کسی بیرونی اصلاح کار تنظیم کی سرپرستی میں عمل میں آئے اس طرح سے مقامی مالکان کے اس عمل کو اہمیت حاصل ہوگی۔ اس فورم کا مقصد اس عمل کے حرکی معیار میں بہتری اور دونوں طرف کے میڈیا کے مابین تعلقات کو بڑھانا اور مجتمع کرنا اور پاک افغان میڈیا کے بڑھتے ہوئے تعلقات کی اہمیت کا ادراک کرنا ہے۔

3- گو کہ اس کے نتائج پہلے سے معلوم نہ ہونگے مگر یہ مشترکہ سوچ فراہم کرے گی کہ آیا اس سلسلے میں مزید اقدام مناسب رہیں گے۔ مثلاً علاقائی کوریج پر نگاہ رکھنے کے لیے پاک افغان محتسب کا قیام۔ بات چیت کا یہ فورم جڑواں صحافت اور ٹیم رپورٹنگ کے عمل کو شروع کرنے یا نہ کرنے کے مسئلے کو بھی زیر غور لا سکتا ہے۔

جڑواں صحافت

رپورٹنگ سے متعلق افراد کے تعاون اور معلومات کے تبادلہ کے ذریعے میڈیا کے اداروں کے مابین مہارت کی بنیاد پر تعلقات کو استوار کرنا۔ ادارتی اور انتظامی سطح پر باہمی دلچسپی بھی اعتماد سازی کا کامیاب طریقہ ثابت ہوا ہے۔ جڑواں صحافت کے پیچھے جو بنیادی فلسفہ کارفرما ہے وہ مل بیٹھ کر سیکھنے کا ایک عمل ہے جس میں دونوں اطراف کے لوگ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

جڑواں صحافت سے ایسی راہ ہموار کی جا سکتی ہے جس میں صحافی بیک وقت بحیثیت ''میزبان'' یا مقامی ماہر اور ایک ''مہمان'' کا کردار بھی ادا کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے دوسری طرف کے ہم پیشہ وہم منصب افراد کے علم، دانش اور ان کے رابطوں سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

جڑواں صحافت سے ایک دوسرے کے ملکوں کے کام کرنے کے طریقوں، ان کی سیاسی وثقافتی روایات سے متعلق معلومات کو بڑھا سکتے ہیں اور اس طرح اپنے صحافتی معیار کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

جڑواں صحافت کے عمل کو سرحدوں کے دونوں جانب کی ضروریات کا بہت زیادہ خیال رکھنا ہوگا۔

عملی تجاویز

1- ایک پائلٹ فیز بنایا جائے جس میں جڑواں صحافت کے عمل کے لیے پاکستان اور افغانستان میں سے منتخب شدہ میڈیا کے ادارے بلائے جائیں۔ مشترکہ جانچ پڑتال کے ذریعے ان شرکت کرنے والوں کے انفرادی طور پر دونوں ملکوں سے چن کر جوڑے بنائے جائیں اور ان کو دونوں ہمسایہ ممالک کے موزوں میڈیا کے اداروں میں بھیجا جائے۔

2- اس پائلٹ فیز کے نتائج کا جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ اس کو جاری رکھا جائے تو مزید بڑے گروپوں کو اس پروگرام میں شمولیت کی دعوت دی جائے تاکہ اس جڑواں صحافت کے پروگرام کو مزید وسعت دی جا سکے۔

مشترکہ یا ٹیم رپورٹنگ

منصوبے کی یہ شکل بہت زیادہ استعمال ہو رہی ہے یہ دیگر صحافیوں اور میڈیا ورکرز کو مشترکہ رپورٹنگ کے عمل سے متعلق متاثر کر سکتی ہے اور صحافتی پیشوں سے منسلک مختلف نسلی اور سیاسی نظریات کے حامل لوگوں کے مابین افہام وتفہیم پیدا کر رہی ہے۔ ٹیم رپورٹنگ بات چیت اور مشترکہ کام کے طریقے کو ترقی دینے کے عمل کے ذریعے یکساں اور منفی تصورات کو ختم اور تبدیل کیا جا سکتا ہے اور ان کی جگہ واضح آگاہی اور اپنے ہم پیشہ افراد سے ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔

تجاویز

1- ٹیم رپورٹنگ کی ایک یا دو مشقوں کو ترقی دیں، جہاں دونوں ممالک کے صحافیوں اور کارکنان مثلاً فوٹو گرافروں اور کارٹونسٹوں کو اکٹھا کیا جائے اور ان کی قومیت سے بالاتر ہو کر سرحد کے آر پار کے حالات سے متعلق ایک مخصوص تناظر میں کسی جاری تنازعہ کے بارے میں خبریں، فیچر اور واقعہ لکھنے کو کہا جائے۔

2- ان مشقوں سے حاصل شدہ نتائج کی بنیاد پر ایک مزید طویل مدتی بین السرحدی ٹیم رپورٹنگ کا عمل قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس منصوبے کو کئی طریقوں سے عملی جامعہ پہنایا جا سکتا ہے۔ ایک طریقہ مبینہ طور پر SCOOP[21] ماڈل کو استعمال کرنے کا ہے۔ اس ماڈل کو مشرقی یورپ اور قفقاز میں کامیابی کے بعد عرب دنیا میں بھی لاگو کیا جا چکا ہے۔ صحافیوں کو چھوٹی چھوٹی گرانٹس دی جاتی ہیں جو انھیں خصوصی موضوعات سے متعلق معلومات کو گہرائی میں جا کر رپورٹنگ کرنے کے قابل بناتی ہیں۔ اس طرح اس مالی مدد کے ساتھ ساتھ ان کی مشاورت اور قانونی مدد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک قابل عمل سکوپ (Scoop) ماڈل پاک افغان اداروں کے مشترکہ تعاون سے ایک فنڈ قائم کرے۔ یہ فنڈ ان صحافیوں کو مالی معاونت کرے جو اس منصوبے پر عمل کر کے سرحد کے پار کی صورتحال اور تنازعات سے متعلق خبروں کی کوریج کے خواہشمند ہوں۔ اس طرح کی دوملکی قومیت کی حامل ٹیم رپورٹنگ کو انفرادی طور پر صحافیوں یا میڈیا کارکنان کی جو ان مسئلوں کی گہرائی تک پہنچ کر ان کی کوریج کے خواہشمند ہوں، مدد کرے، اس طرح ان منصوبوں کو تکمیل تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

5.3 شورش زدہ علاقوں میں معلومات کا فقدان

پس منظر اور توجیہ

بہت سے علاقے مثلاً فاٹا، سرحد اور بلوچستان میں معلومات کا خلاء ہے۔ خصوصاً فاٹا اور سرحد میں پچھلے چند سالوں سے معلومات کے معاملے میں کمی کا سامنا رہا ہے جب سے پاکستانی حکومت، پاک افواج اور پاکستانی طالبان اور عسکریت پسندوں کے درمیان تنازعات نے زور پکڑا ہے یہ صورتحال ان علاقوں میں اور بھی سنگین ہو چکی ہے۔ جہاں طالبان نے کنٹرول حاصل کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ ان میں سے بہت سے علاقوں میں عسکریت پسندوں نے اپنی بنیاد پرستی کی ترویج کے لیے میڈیا اسٹیشن قائم کر لیے ہیں۔

فاٹا میں کوئی بھی مقامی صحافتی ادارہ نہیں ہے اور باہر سے بیٹھ کر صورت حال کا جائزہ لینا پاکستانی میڈیا کے لیے بہت مشکل ہے۔ اگرچہ کچھ ایف ایم ریڈیو چینلز اور حکومتی ٹی وی کی نشریات ان علاقوں تک پہنچتی ہیں۔ میڈیا سپورٹ آرگنائزیشن کو بھی اپنا عملہ وہاں رکھنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑا۔

بلوچستان میں معلومات کا خلاء نیا نہیں بلکہ یہ حکومت کی طویل مدتی پالیسیوں اور ترقی میں پیچھے رہ جانے کا نتیجہ ہے۔ خصوصاً بلوچستان کے شمالی علاقوں تک رسائی ناممکن نہیں لیکن مشکل ضرور ہے۔ بلوچستان کے دیگر علاقوں میں جہاں پر معلومات کا خلاء بہت شدید ہے وہاں تک رسائی تو ممکن ہے مگر وہ بھی خاصے دور دراز واقع ہیں اور سہولیات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

عسکریت پسندوں کی یہ حکمت عملی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اوپر تنقید کرنے والے مخالفین کو ختم کر کے اور قتل و غارت اور بے یقینی کی فضاء پیدا کر کے سماجی معاشی اور معاشرتی ڈھانچے کو تباہ کر دیں۔ اس منصوبے کا ایک خاص عنصر یہ بھی ہے کہ دیہی آبادی کو بیرونی دنیا سے آنے والی معلومات سے محروم کر دیا جائے اور وہ حقیقی اور متوازن معلومات کی بجائے صرف نفرت انگیز تقریریں اور پروپیگنڈہ ہی سن پاتے ہیں۔ تو اس علاقے کی آبادی کو جہاں معلومات نہ پہنچ رہی ہوں یا جہاں پروپیگنڈہ اور بنیاد پرستی سے متعلق معلومات ہی ہوں وہاں معلومات بہم پہنچانا بہت ضروری ہے تاکہ بنیاد پرستی کا ازالہ کیا جا سکے۔ ان ترقی پذیر علاقوں میں معلومات تک بہتر رسائی معاشی اور معاشرتی ترقی کا باعث بنے گی۔

اہم تجاویز

فاٹا اور سرحد کے ان علاقوں میں جہاں عسکریت پسندوں کا غلبہ ہے یا وہ مسلسل خطرات سے دوچار ہیں۔ ان خطوں میں عسکری یا سیاسی تبدیلیوں کی تفصیلات پر مبنی خبریں جو فوج یا عسکریت پسندوں کے نقطۂ نظر سے غیر پسندیدہ ہوں ان کی اشاعت

21 SCOOP پر مزید معلومات کے لیے مندرجہ ذیل ویب سائٹ دیکھیے:
www.i-m-s.dk/node/97

کی وجہ سے صحافتی اداروں کا قیام بہت مشکل ہو گیا ہے اسی دوران علاقائی میڈیا کے ادارے جو کہ سماجی مسائل کے متعلق زیادہ غیر جانبدار موضوعات مثلاً صحت، تعلیم اور دیگر معاشی مسائل اجاگر کرتے ہوں ان کا قیام آسان ہو جائے گا اور یوں فوج اور عسکریت پسندوں کی مخالفت مول لیے بغیر ان کی مدد کی جاسکتی ہے۔ اس قسم کی کوششوں کو ان علاقوں سے باہر قائم ریڈیو اسٹیشن کی نشریات کی صلاحیت کو بڑھانے کے عمل سے یکجا کیا جاسکتا ہے۔ ابلاغ کے دیگر متبادل ذرائع مثلاً نئی انفارمیشن ٹیکنالوجی میں امکانات کی تلاش کے ساتھ ساتھ معلومات کے مختلف روایتی ذرائع کا فروغ بھی ان علاقوں میں بہتر ثابت ہوسکتا ہے۔ ان کوششوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان بنیاد پرستانہ رکاوٹوں سے متعلق مسائل کی علم وآگاہی بھی عام کی جائے کیونکہ یہ بنیاد پرستی غیر شدت پسند میڈیا میں بھی پھیل سکتی ہے۔

بلوچستان میں معلومات کے اس خلاء کو زیادہ معیاری پروگراموں کے ذریعے ختم کیا جاسکتا ہے اور یہاں عوامی ریڈیو اسٹیشن قائم کیے جاسکتے ہیں۔ مگر ایسا کرتے ہوئے اس خیال کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ یہ علاقے بھی عسکریت پسند گروپوں سے متاثر ہیں۔ خصوصی طور پر وہ طریقے جو معلومات کے خلاء اور صحافتی رکاوٹوں سے نمٹنے میں معاون ثابت ہوں اس کے لیے ان تین شعبوں میں کام کرنا ضروری ہے۔

- میڈیا میں بنیاد پرستی سے متعلق آگاہی کو بڑھانا
- ریڈیو اسٹیشن کا قیام اور ان کے حلقہ اثر کا پھیلاؤ
- نئے اور روایتی میڈیا کی وساطت سے معلومات کی تلاش اور جواں ہمتی سے ان کی ترسیل ممکن بنانا۔

میڈیا میں بنیاد پرستی سے متعلق آگاہی کو بڑھانا

اگرچہ میڈیا کی بنیاد پرستی سے متعلق معلومات اور تجزیات میں اضافہ ہو رہا ہے مثلاً پاکستان انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز (PIPS) کے مطابق اس منظر کو سمجھنے کے لیے مزید کھوج اور افہام وتفہیم کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کو بھی یقینی بنایا جائے کہ متعلقہ تحقیقی مواد اور ڈیٹا، میڈیا کمیونٹی کو بطریقِ احسن منتقل ہو جائے۔

تجاویز

1- میڈیا مواد اور تجزیوں کی دیگر قسموں کو جو کہ بنیاد پرست میڈیا سے متعلق ہوں اس کی جانچ پڑتال اور نگرانی کے عمل کو آگے بڑھانا تاکہ میڈیا روشن خیالی سے متعلق آگاہی کے متعلق علمی اقدامات کرنے کی بنیاد فراہم کر سکے۔ اس تحقیق میں یہ شناخت بھی شامل ہو کہ کون سا میڈیا بنیاد پرستانہ مواد کو آگے بڑھانے کے لیے استعمال ہو رہا ہے اور اس کے علاوہ ریڈیو، ٹی وی، پرنٹ میڈیا اور موبائل ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کی بنیاد پر قائم میڈیا کا بھی تجزیہ ضروری ہے۔

ریڈیو اسٹیشنوں کا قیام اور پھیلاؤ

بہتر معلومات اور خبروں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ریڈیو ایک بہترین انتخاب ہے کیونکہ اس میں فاٹا، صوبہ سرحد اور بلوچستان کے دور افتادہ اور دیہی علاقوں تک معلومات پہنچانے کی صلاحیت موجود ہے۔ تجارتی اور علاقائی دونوں قسموں کے ریڈیو اسٹیشنز کو مدنظر رکھنا چاہیے کیونکہ دونوں کی اپنی علیحدہ اہمیت ہے۔

تجاویز

1- پہلے سے موجود علاقائی ریڈیوز کی مدد اور فاٹا، سرحد اور بلوچستان میں مزید ریڈیو اسٹیشنز کا قیام تجویز کیا جاتا ہے۔ فاٹا میں جہاں کوئی مقامی ریڈیو اسٹیشن نہیں ہے ان سے وہاں کی مقامی آبادی کے مسائل کو اجاگر کرنے میں مدد ملے گی۔ فاٹا میں جہاں پیمرا کی اتھارٹی نہیں ہے ریڈیو کے قیام کے لیے پہلے قدم کے طور پر وزارت اطلاعات یا گورنر سے منظوری حاصل کرنا ہوگی۔ سرحد اور بلوچستان میں لائسنس حاصل کرنے کے لیے اندرونی حمائت درکار ہوگی۔ مقامی ریڈیو کے قیام کے لیے بہت سے عملی اقدامات پہلے سے ہی جاری ہیں۔ سب سے پہلے ان شعبوں اور ضروریات کو جنہیں ابھی

تک ٹھیک نہیں کیا جا سکا، کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ مزید براں، ماضی کے حاصل شدہ تجربات کی روشنی میں میڈیا اسٹیشنوں کے مالکان کے درمیان بات چیت کے نتائج کو ایک جگہ جمع کر کے سفارشات مرتب کی جائیں۔

2- مخصوص علاقوں میں جغرافیائی طور پر رسائی اور ایڈیٹوریل مواد کی بنیاد پر میڈیا کی موجودگی کو مضبوط بنانے کے عمل کو مدنظر رکھا جائے۔ آج کل، چند ایف ایم ریڈیو جو کہ علاقے میں اپنے پروگرام نشر کر رہے ہیں وہ بنیاد پرستی کے پرچار کر ہیں جبکہ دیگر علاقوں میں ریڈیو کی رسائی بالکل نہیں ہے۔ چنانچہ ان علاقوں میں میڈیا کی زیادہ سے زیادہ رسائی کو ممکن بنایا جائے۔ جہاں ضروری ہو خبروں کے اسٹیشن اور ایڈیٹوریل کی صلاحیت میں بہتری اور حوصلہ افزائی کے لیے ہر ممکن امداد اور حمایت کی جائے۔

نیا اور روایتی میڈیا

عمومی سطح پر نیا میڈیا پلیٹ فارم مثلاً موبائل فون ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ پلیٹ فارم پاکستان میں مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ خصوصاً نئی نسل میں اسے خاصی پذیرائی ملی ہے۔ آئی ایم ایس مشن نے ابھی تک سرحد، فاٹا اور بلوچستان میں ان نئی تکنیکوں کے پھیلاؤ اور استعمال کی کوئی جامع تصویر کشی نہیں کی۔ مگر یہ دیکھا گیا ہے کہ دوسرے علاقوں کی نسبت موبائل فون کا استعمال ان علاقوں میں عام نہیں ہوا اور اس آبادی کی اہم جز وجیسے خواتین کو اس ٹیکنالوجی تک کم رسائی حاصل ہے۔ اس کے باوجود یہاں صلاحیتوں کا فقدان نہیں اور امکانات کو تلاش کرنا بہت اہم ہے۔ اسی طرح معاشرے میں اکٹھا ہونے کے روایتی طریقے، جیسے جمعہ کے اجتماعات اور دیگر مواقع بھی اسی طرح اہم ہیں اور ان کو بھی معلومات پھیلانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اس ضمن میں تجاویز درج ذیل ہیں:

1- ان بہت سارے احکامات کا جو کہ موبائل ٹیکنالوجی کو بطور معلومات کے حصول اور اس کے پھیلاؤ کے لیے موجود ہیں ان کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے خواتین میں اس کے استعمال کو بہتر بنانے پر توجہ دی جائے، جو کہ عموماً معلومات کی رسائی سے محروم رکھی جاتی ہیں۔ پسماندہ معاشرے میں مواصلات کے ذرائع کی تحقیق اور موبائل ٹیکنالوجی اور دیگر ٹیکنالوجیز اور اس کے ساتھ دیگر ذرائع مواصلات جو کہ پہلے سے زیر استعمال ہیں۔ ان کے متعلق معلومات کو بڑھانا چاہیے۔

2- ان تحقیقات کی روشنی میں ذرائع مواصلات کے دیگر امکانات بھی بہتر بنائے جا سکتے ہیں۔ نئے اور روایتی ذرائع کا امتزاج بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ جب اس ٹیکنالوجی کے استعمال کے منصوبے بہتر کرنے ہوں تو تجارتی اداروں، میڈیا کی ترقی کے اداروں اور علاقائی بنیاد پر قائم میڈیا کے درمیان مشترک اقدار کو ضرور تلاش کیا جانا چاہیے۔

5.4 صحافتی قابلیت (صحافت کا معیار)

پس منظر اور توجیہہ

پاکستانی میڈیا کا معیار درجہ بندی کے حوالے سے نچلی سطح سے لے کر اوپر تک غیر یقینی رہا ہے اور خصوصاً علاقائی زبانوں کے اخبارات کی حالت دیگر پریس کی طرح قابل رحم ہے۔ پیشہ ورانہ مہارت، معیاری رپورٹنگ اور تجزیاتی بنیادوں پر صرف بڑے ٹی وی سٹیشنوں کے نیوز پروگراموں میں یا انگریزی پریس اور بڑے اردو اخبارات میں ہی نمائندگی پائی جاتی ہے۔

درست اور متوازن رپورٹنگ کی بجائے عموماً سنسنی خیزیت پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے ایسی رپورٹنگ کو بھی ترجیح دی جاتی رہی جس کی ساری توجہ بریکنگ نیوز، متاثر کن اور ڈرامائی سیاسی تبدیلیوں کی لحہ لحہ صورت حال پر رہتی، اب تک بغیر کسی پس منظر اور سیاق وسباق کی رپورٹنگ کی ہی حوصلہ افزائی کی جاتی رہی ہے۔

جب سنسنی خیزی یا ہیجانی دور شروع ہوتا ہے تو یہ میڈیا غیر ارادی طور پر بنیاد پرستی پر مشتمل پروپیگنڈے اور جانبدارانہ رویے کو جو کہ کسی خاص سیاسی ایجنڈے کی ترویج کے لیے کیا جاتا ہے اس کو نشر کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے مقصدیت ختم ہو جاتی

ہے۔ ٹی وی کے مذاکروں کے نمایاں میزبان بجائے اس کے کہ وہ سیاسی یا معاشی اور معاشرتی معاملات پر گہرائی سے کوریج فراہم کریں وہ اکثر سیاسی جماعتوں کے نمائندے بن جاتے ہیں اور ایسے الزامات میں الجھ جاتے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

خاص طور پر خارجہ امور اور ہمسایہ ممالک سے تعلقات کی کوریج کی رپورٹنگ ایک ہی پیمانے پر مبنی ہوتی ہے جس میں پاکستان کے اپنے کردار کے متعلق چھان بین کم ہی کی جاتی ہے۔ پاکستانی میڈیا اکثر اوقات یا تو حقائق کو تسلیم نہیں کرتا یا وہ دباؤ کے تحت کام کرتا ہے اور حکومتی یا فوجی حلقے ان موضوعات پر بات ہی نہیں کرتے جو کہ حکومت یا فوج کی پالیسیوں کے اوپر تنقید سے متعلق ہوں۔

تحقیقی صحافت کم نظر آتی ہے عموماً سماجی مسائل، جنسی مسائل اور ایک عام پاکستانی کی زندگی کو ہی زیر بحث لایا جاتا ہے۔ انفرادی طور پر صحافتی تحقیق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کرپشن، انسانی یا اقلیتی حقوق کی خلاف ورزیوں اور ایک عام آدمی پر پڑنے والے سیاسی اثرات کے متعلق یا ظالموں کو بے نقاب کرنے پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

عملی اقدامات

اگر میڈیا کو کم سن پاکستانی جمہوریت کے سیاست دانوں اور حکومتی اداروں کی چھان بین اور اس کے نگہبان کا کردار ادا کرنا ہے تو پھر زیادہ گہرائی سے تحقیقی صحافت کی ضرورت ہوگی۔ مزید براں تحقیقی اور متوازن رپورٹنگ عام شہری کے لیے علاقائی سیاست کے متعلق مزید واضح تصورات قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔

بہترین معیار کی صحافت جس کی توجہ سنسنی خیزی پر کم ہو شدت پسندوں اور سیاستدانوں کے ان غیر متوازن دلائل اور خبروں کو پنپنے کے لیے بہت کم موقع دے گی۔ جنہیں وہ اپنے بنیاد پرستانہ خیالات کو پھیلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ میڈیا ایک قابل عمل جمہوریت کے لیے کلیدی کردار ادا کرسکتا ہے۔ لیکن یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک فرسودہ، مصنوعی طریقے اور سنسنی خیزی سے مقاصد حاصل کرنے کے رجحانات پر قابو نہ پا لیا جائے یقیناً ہیجان خیزی کے ان عناصر کو مدنظر رکھنا چاہیے جو میڈیا اسٹیشنوں کے مابین جاری مقابلہ کے رجحان میں اہم حیثیت کے حامل ہیں۔ میڈیا اسٹیشن کی جانب سے اس ہیجان خیزی کے بڑھتے ہوئے عوامل کو کم کرنے کے بارے میں مزاحمت کی بھی توقع رکھنی چاہیے۔

خاص طور پر مندرجہ ذیل دو شعبوں میں کام کر کے معیاری صحافت کے عمل دخل کو بڑھایا جاسکتا ہے:

- تحقیقی رپورٹنگ کی ترویج وترقی اور
- خود اصلاحی نظام کی مضبوطی

تحقیقی صحافت کی ترویج وترقی

تحقیقی صحافت کی ترقی کے بہت سے مقاصد ہیں۔ یہ صحافی کو بالغ النظر بنائے اور اس کی جامع رپورٹنگ کی صلاحیت کو بڑھائے گی۔ مثلاً طاقت کا غلط استعمال، مالی بدعنوانیاں، بے ضابطگی اور دیگر معاملات مثلاً وہ لوگ جن کے پاس اختیارات ہیں ان کا احتساب کرنا تاکہ جمہوریت کو مضبوط کیا جاسکے۔ مزید براں تحقیقی مہارت میں تربیت اور تحقیقی رپورٹنگ کی ترویج کے ذریعے سے ایک محقق صحافی کا وجود اپنی میڈیا کمیونٹی میں موجود دیگر ہم عصروں کے لیے ایک مثالی نمونہ بن سکتا ہے۔

مزید تجاویز درج ذیل ہیں:

1- تحقیقی صحافت کو تربیت کے ذریعے مضبوط بنایا جاسکتا ہے اور مالی معاونت بھی کی جاسکتی ہے جو کہ صحافی کو وسیع پیمانے پر تحقیقی منصوبے شروع کرنے میں مددگار ثابت ہوگی تحقیقی صحافت کے لیے تربیت مقامی شراکت داروں یا پشاور یونیورسٹی کی وساطت سے بھی دی جاسکتی ہے۔ پاکستان، بین الاقوامی اور مقامی ماہرین کے قریبی تعاون سے مرتب کرسکتا ہے جس سے تعلقات اور مقامی صلاحیت میں بہتری آئے گی۔

2- تعمیری صلاحیت کے بہتر بنانے کے عمل کو ایک ایسے تحقیقی صحافتی فنڈ سے مدد کی جائے جو کہ ان تحقیقی منصوبوں پر توجہ مرکوز کرنے کے سلسلے میں وظائف کا اجراء کرے جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آ سکے۔ اس کے لیے ممکنہ موضوعات پاک افغان تعلقات، اقلیتی امور، عوامی فلاح و بہبود، عورتوں کے حقوق، بدعنوانیاں اور سماجی مسائل ہو سکتے ہیں۔

خود اصلاحی کی ضرورت

اپنی اصلاح کا نظام ہیجان خیزی اور پاکستانی صحافت کے معیار کو بڑھانے میں بھرپور کردار ادا کر سکتا ہے اگر اس عمل کو حقیقی طور پر نافذ کرنا ہے یا اس میں کامیابی حاصل کرنی ہے تو پھر اسے مضبوط کرنے کے عمل کی ذمہ داری میڈیا اسٹیشنوں سے ایڈیٹوریل نمائندوں، صحافتی عملے، میڈیا ایسوسی ایشنوں اور صحافیوں، صحافتی کارکنان ان کی یونینوں اور سول سوسائٹی کو منتقل کی جانی چاہیے۔ بہت سے ان ممالک کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جہاں سول سوسائٹی کے ارکان کو جو کہ میڈیا کے استعمال کنندگان تھے ان کو اس خود اصلاحی نظام کا حصہ بنا دیا گیا۔

سب سے پہلے اقدام کے طور پر پرنٹ میڈیا میں اس خود اصلاحی کے نظام کو نافذ کرنے پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ پرنٹ میڈیا کے متعلق اس قسم کے اقدامات نشریاتی میڈیا کی آنکھیں کھولنے کے لیے مفید ہو سکتے ہیں کیونکہ نشریاتی صنعت سے منسلک مختلف النوع لوگوں کو یکجا کرنے کی ضرورت ہے خود میڈیا اسٹیشنوں کے درمیان رابطے بھی ممد و معاون ثابت ہوں گے۔

چند تجاویز کچھ یوں ہیں:

1- کھلے مباحثوں اور لابی کے ذریعے میڈیا انڈسٹری کے مختلف شعبوں میں خود اصلاحی نظام کے فوائد حاصل کرنے کی تحریک چلائی جائے۔ خاص طور پر میڈیا مالکان اور ایڈیٹرز کی حمائیت حاصل کرنے پر بھرپور توجہ دی جائے۔ اس کے متعلق صحافی برادری میں پہلے سے ہی وسیع پیمانے پر مشترک سوچ پائی جاتی ہے۔ میڈیا ارکان کے لیے اس میں مالی فوائد پوشیدہ ہیں کیونکہ قانونی معاملات پر خود اصلاحی نظام کو مالی ترجیحات حاصل ہیں۔ مالکان کے لیے قانونی اخراجات کی نسبت اس کم لاگتی خود اصلاحی نظام کے بہت سے مالی فوائد ہیں جو کہ میڈیا مالکان کے لیے پرکشش ہونے کا باعث بن سکتے ہیں۔

2- میڈیا سے متعلق لوگوں کے مابین ایک مشترک مقصد کے حصول کے لیے اتحاد پیدا کرنا۔ اداروں کے مابین اس طرح کے عملی اقدامات مذکورہ تحریک کے لیے ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ پاکستان میں ایک بڑی کانفرنس کا انعقاد جو کہ مختلف کرداروں کو ایک چھتری کے نیچے اور ایک نعرہ کے لیے جمع کرے اس کی متبادل تجویز ہو سکتی ہے۔

3- نمایاں کرداروں کو علاقائی اور بین الاقوامی خود اصلاحی کے بہترین استعمال سے آگاہی کی مشترکہ کوششیں ہونی چاہئیں۔ اس قسم کے اقدامات نہ صرف پاکستانی میڈیا کے مختلف عناصر کو دوسروں کے تجربات کے متعلق آگاہی فراہم کریں گے بلکہ یہ ان کی سوجھ بوجھ اور سمجھنے کی صلاحیت میں بھی اچھا اضافہ ثابت ہوگا۔

6 لف شدہ مواد

6.1 انٹرویوز کی تفصیل

آج ٹی وی
خالد جمیل، بیورو چیف
نصرت جاوید، ڈائریکٹر کرنٹ افیئرز
محمد مشتاق صدیقی، ڈائریکٹر نیوز کوارڈی نیشن پلاننگ

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ماس کیمونیکیشن ڈیپارٹمنٹ
سید عبدالسراج، چیئرمین/ ایسوسی ایٹ پروفیسر

روزنامہ نوائے وقت
جاوید صدیق، ایڈیٹر

ڈان گروپ آف نیوز پیپرز
ظفر عباس، ریذیڈنٹ ایڈیٹر

فریڈرچ ایبر ہارٹ سٹفٹنگ
ہیننگ ایفنر، کنٹری ڈائریکٹر
عبدالقادر، پروگرام کوآرڈی نیٹر

جیو ٹی وی
فرخ تنویر ملک، سینئر اسائمنٹ ایڈیٹر

انٹرنیشنل کرائسز گروپ
ثمینہ احمد، پروجیکٹ ڈائریکٹر

انٹرنیشنل فیڈریشن آف جرنلسٹس۔ پاکستان (IFJ)
محمد فاروق، پراجیکٹ کوآرڈینیٹر

انٹرویوز
عدنان رحمت، کنٹری ڈائریکٹر
مطیع اللہ جان، کنسلٹنٹ

وزارت اطلاعات
شبیر انور، پرنسپل انفارمیشن آفیسر

نیشنل پریس کلب
طارق محمود، صدر

آن لائن، انٹرنیشنل نیوز نیٹ ورک
انیلہ رضی الدین، نیوز ایڈیٹر

پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی (PEMRA)
ڈاکٹر عبدالجبار، ایگزیکٹو ممبر

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (PFUJ)
مظہر عباس، سیکرٹری جنرل، اسلام آباد

پاکستان انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز (PIPS)
محمد عامر رانا، ڈائریکٹر
محمد اعظم، ایسوسی ایٹ ایڈیٹر PIPS ریسرچ جرنل
صفدر حسین، کوارڈینیٹر، کنفلکٹ اینڈ سیکورٹی سیکشن
سجاد اظہر، میڈیا اینڈ ایونٹ کوارڈینیٹر

پشاور یونیورسٹی، ماس کمیونیکیشن اینڈ جرنلزم ڈیپارٹمنٹ
الطاف اللہ خان، اسسٹنٹ پروفیسر
اورنگ زیب خان، ریسرچ جرنلسٹ

ریڈیو پاور 99
نجیب احمد، ڈائریکٹر وایڈیٹر

ساؤتھ ایشیا فری میڈیا ایسوسی ایشن (SAFMA)
نصرت جاوید، پاکستان چیپٹر پریذیڈنٹ
مستنصر جاوید، جنرل سیکرٹری

دی نیوز پشاور
رحیم اللہ یوسفزئی، ایڈیٹر ان چیف

یو کے ایس۔ ریسرچ، ریسورس اینڈ پبلیکیشن سنٹر آن ویمن اینڈ میڈیا
تسنیم احمر، ڈائریکٹر

6.2 تحریری ماخذات

اعظم، محمد (2000ء): ریڈیکلائزیشن اینڈ میڈیا، کنفلکٹ اینڈ پیس سٹڈیز، والیم 1، PIPS، 2008

کوہن سٹیفن (2004): دی آئیڈیا آف پاکستان بروکنگز انسٹی ٹیوشن پریس، 2004

حقانی، حسین (2005): پاکستان بیٹوین ماسق اینڈ ملٹری، کارنیگی اینڈ وومنٹ فار انٹرنیشنل پیس، 2005

انٹرنیشنل کرائسز گروپ (2007): پاکستان دی فارگوٹن کنفلکٹ ان بلوچستان، ICG 2007

کیری، جان اینڈ چک ہیگل (2009): پاکستان رپورٹ، کمپری ہینسو یو ایس پالیسی نیڈڈ، اٹلانٹک کونسل، 2009

مرکی ڈینئل (2008): سیکورنگ پاکستان ٹرائیبل بیلٹ کونسل فار فارن ریلیشنز، نمبر 36، اگست 2008

رانا، محمد عامر (2008): جہادی پرنٹ میڈیا ان پاکستان: این اوورویو، کنفلکٹ اینڈ پیس سٹڈیز، والیم 1، PIPS، 2008

صدیقہ، عائشہ (2007): ملٹری Inc: ان سائیڈ پاکستانی ملٹری اکانومی، پلوٹو پریس، 2007

یونیسکو (2007): دی ایجوکیشن سسٹم ان پاکستان: اسسمنٹ آف دی نیشنل ایجوکیشن سیکٹر: یونیسکو اسلام آباد، 2007

مونوگرام

(پاکستان میں ترجمے اور تقسیم کا اہتمام پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز، اسلام آباد نے کیا۔)